بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۱ | ۱۰، ۲۵/اپریل ۲۰۲۴ء مطابق یکم و ۱۵/شوال المکرم ۱۴۴۵ھ | شمارہ نمبر ۱۱-۱۲

سرپرست

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی

نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر: محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت: مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

## اس شمارے میں


| | | |
|---|---|---|
| مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ..... | علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ | ۴ |
| .....اے گردشِ ایام | محمد عمیر الصدیق ندوی | ۵ |
| مدارس وجامعات کا بہترین تعارف | حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ | ۷ |
| دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت | حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ | ۱۰ |
| امتِ مسلمہ کا فرض منصبی اور..... | مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی | ۱۳ |
| اسلامی تشخص اور اسلامی شناخت..... | مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ | ۱۵ |
| مغربی نظامِ تعلیم مسلمانوں کے لیے..... | مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی | ۱۸ |
| قلب وروح کی اصلاح | مولانا خالد سیف اللہ رحمانی | ۱۹ |
| ہمارا سب سے مؤثر ہتھیار | مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی | ۲۲ |
| حسد انسان کو ہلاک کر دیتا ہے | مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی | ۲۵ |
| حق وباطل کے درمیان فیصلہ کن..... | ڈاکٹر سراج الدین ندوی | ۲۷ |
| صحیح مسلم کے امتیازات وخصوصیات | مولانا فخر الدین طیب ندوی | ۲۹ |
| اخلاق واعمال کا فساد اور اس کے نتائج | محمد عثمان خان ندوی | ۳۳ |
| سرخ طوفانی ہواؤں کو..... | محمد جلیل اختر جلیلی ندوی | ۳۵ |
| قضیۂ فلسطین اور اس کا اسلامی مزاج | محمد فرمان ندوی | ۳۸ |
| اسلام کی سربلندی اور مہذب دنیا..... | محمد اعظم ندوی | ۴۲ |
| ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی..... | محمد ارمغان بدایونی ندوی | ۴۵ |
| حضرت مولاناؒ بحیثیت ادیب | محمد مکرم ندوی | ۴۷ |
| سوال وجواب | مفتی محمد ظفر عالم ندوی | ۴۹ |


قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

**TAMEER E HAYAT**
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ایم میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

**TAMEER-E-HAYAT**
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔


| سالانہ زرتعاون -/400 | فی شمارہ -/20 | ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے 75$ |
|---|---|---|

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلدی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

# مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

واعظِ قوم کی وہ پُختہ خیالی نہ رہی　　برق طبعی نہ رہی، شُعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں، رُوحِ بِلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک　　عدل اس کا تھا قوی، لوثِ مراعات سے پاک
شجَرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نم ناک　　تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق الادراک
خود گدازی نمِ کیفیّت صہبایش بود
خالی از خویش شُدن صورتِ مینایش بود

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا　　اُس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اُسے قوّتِ بازو پر تھا　　ہے تمھیں موت کا ڈر، اُس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا عِلم نہ بیٹے کو اگر اَزبر ہو
پھر پِسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو!

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے　　تم مسلماں ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے!
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے　　تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قُرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضب ناک، وہ آپس میں رحیم　　تم خطاکار و خطابیں، وہ خطاپوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریّا پہ مقیم　　پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی اُن کا تھا، سریرِ کے بھی
یونہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیّت ہے بھی؟

☆☆☆☆☆

اداریہ

# .....اے گردشِ ایام

محمد عمیر الصدیق ندوی

گردشِ ایام کا لفظ ہماری زبانوں پر اکثر آتا رہتا ہے؛ لیکن گردش اور ایام دونوں میں معنی بلکہ معانی کی جو دنیا آباد ہے، اس کی جانب توجہ کم ہی ہوتی ہے، اپنی زندگی کے شب و روز سے یہ احساس پختہ ہوتا جاتا ہے کہ ہمارا دور ترقی، جدیدیت اور ایسے ظاہر سے آباد ہے جن کا دورِ ماضی میں وجود کیا' تصور تک نہ تھا؛ لیکن گردش کے معنی سامنے ہوں تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ جواب ہے ویسا پہلے بھی دیکھا جاچکا ہے، انقلاب وحوادث کے طوفان پہلے بھی اٹھے، نئے نئے خیالات ونظریات کا سامنا پہلے بھی کیا گیا، حق و باطل کے مناظرے، مجادلے پہلے بھی بپا ہوتے رہے اور دنیا کا امن چین پہلے بھی غارت ہوتا رہا، غارت گر اقوام حکمراں بھی آج کی طرح پہلے بھی صورتِ چنگیز ظاہر ہوتے رہے۔

اس ساری غیر مرتب تمہید کا مقصد ان دنوں کو یاد کرنا ہے جب ملک کے مسائل آج ہی کی طرح تھے، جب حساس مسلمانوں کے دل آج ہی کی طرح مضطر تھے، جب خدا کے گھر آج ہی کی طرح لڑائی کے میدان بن گئے تھے، جب آج ہی کی طرح قوم کے نئے رہبر اور رہنما کا شدت سے انتظار تھا، قریب سوا سو سال پہلے کی ضرورتوں کو سمجھنے والے وہ سنجیدہ ترین لوگ تھے جن کو باکمال نفوس کہا گیا، جن کے ناموں کو متبرک سمجھا گیا، ان کے ناموں پر ایک نگاہ ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کس پایہ کے لوگ تھے، یہ ۱۸۹۲ء کی بات ہے، جب فیض عام کانپور سے ندوۃ العلماء کے سرچشمۂ فیض کی یافت کا اعلان ہوا، پھر ندوہ کی تعمیر میں کیسے کیسے تاریخی مناظر سامنے آتے گئے، اسلامی ہند کی اتنی متنوع اور متضاد ہستیاں شاید ہی کسی ایک مرکز پر اس سے پہلے نظر آئی ہوں، ان کے ناموں کو دیکھئے تو یہ الفاظ حقیقت کی تصویر بن جاتے ہیں کہ یہ اسلامی ہندوستان کے گزشتہ دور کے وہ نام نامی ہیں جن پر اس دور کو پورا فخر وناز ہے۔

ندوہ کا پہلا اجلاس اپریل ۱۸۹۴ء میں ہوا، اور پھر سال بہ سال یہ سلسلہ جاری رہنے لگا، یہاں ان اجلاسوں کے شرکاء، اس کی کاروائیوں، تجویزوں اور تقریروں کا بالاستیعاب ذکر مقصود نہیں، حالانکہ ان جلسوں کی رودادیں دیکھنے سے آج بھی جیسے عزائم اور ارادوں میں ایک نئی روح سی دوڑ جاتی ہے، ان کاروائیوں کے ذکر سے رجالِ ندوہ کے سوانح بھرے ہوئے ہیں اور صاف صاف بتاتے ہیں کہ محض ۲۰/سال کے عرصہ میں ندوہ کے ذریعہ اردو زبان میں علمی مباحث کا بڑا ذخیرہ پیدا ہوگیا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور جب یہ تعبیر بیان کی جائے تو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں' انگریز اور انگریزیت سے متاثر اس طبقہ کو دھیان میں لانا چاہیے جہاں اسلام سے نسبت پر خجالت کا عام طور پر اثر دیکھا جاتا تھا، اس تعلیم یافتہ طبقہ کو ندوہ نے اسلام کے علمی اور فکری کارناموں سے آشنا کرکے ان کے احساس کمتری کو دور کرنے کا وہ فریضہ انجام دیا جس کے لیے ندوہ قائم ہی کیا گیا تھا، یہ بات

بھی اسی کم مدت میں دیکھنے میں آئی کہ علماء جدید مسائل سے روشناس ہونے لگے، عربی طلبہ کو قدیم مراجع و مآخذ سے کام لینے کا سلیقہ پیدا ہوا اور سب سے بڑھ کر اسلام اور تاریخِ اسلام پر بہت سے اعتراضوں کو دفع کیا گیا۔

یہ وہ سچائیاں ہیں جن کا اعتراف مسلسل ہوتا رہا ہے، اور یہ ہوتے رہنا چاہیے، ندوہ کو اور ندوہ والوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسے رجال کار عطا کیے جنہوں نے ندوہ کے مقاصد اور اس سے عہدہ برآ ہونے میں کبھی کوئی کمی نہیں کی، یہ محض دعوی نہیں یا عقیدت میں ڈوبا کوئی نعرہ نہیں، ۱۹۱۵ء میں جب ندوہ کے بانی اکابر علماء تعداد میں کم رہ گئے تھے، اس وقت ندوہ کی سب سے روشن دلیل، ندوہ کے نفوس قدسیہ کی دعاؤں کا ثمرہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شکل میں ندوہ کے سالانہ اجلاس میں سامنے آیا، اس اجلاس کی روداد میں سید صاحبؒ کے یہ الفاظ محفوظ ہیں کہ ''یہ پہلا موقع ہے کہ خود دارالعلوم کا آغوش پروردہ آج اپنی ضرورت کا اعلان کرتا ہے''۔ یہ اعلان کیا ہے؟ ۱۹۱۵ء اور ۲۰۲۴ء میں ایک سو دس سال کا فاصلہ ہے؛ لیکن منظر نامہ لگتا ہے کہ آج ہی کا ہے، سید صاحب نے انقلابِ زمانہ اور تسلسلِ حوادث کے نتیجہ میں جن مشکلات کا ذکر کیا، ان میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ لائقِ توجہ، مذہب اور مذہبی علوم کی بقا و حفاظت کا مسئلہ تھا، انہوں نے دیکھا کہ مسلمان آج اعتراضات اور حملوں کی آماجگاہ ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ ہاتھ بچاؤ کہ اس کے بغیر کسب و تحصیل محال ہے، پاؤں بچاؤ کہ بے پاؤں میدان میں تگا پو ناممکن ہے؛ لیکن میں کہتا ہوں کہ سینہ بچاؤ کہ اس میں دل ہے جو زندگی کا گھر ہے، قومیت اسلامیہ کا دل کیا ہے؟ مذہب ہے! تمام دنیا میں مذہب قومیت سے ہے؛ لیکن مسلمانوں میں قومیت مذہب سے ہے، یہی وہ احساسات تھے جب روشن ضمیر بزرگوں نے ندوہ کی مجلس مرتب کی، علمائے ہند کا مشغلہ صرف نزاع و کشاکش باہمی تھا، خواب سے چونکے، محبت اور ہمدردی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بالآخر قوم کے تمام امراض کا علاج ندوہ کا دارالعلوم قرار پایا۔

سید صاحب علیہ الرحمہ کی یہ تقریر تو اس لائق ہے کہ بار بار پوری کی پوری شائع ہوتی رہے، ندوہ کی ضرورت، اس کے وجود کی اہمیت، اور اس سے بڑھ کر ندوہ والوں کی شناخت کی تکرار ہوتی رہے، اس کی تربیت میں پنہاں ان جذبوں کی تجدید ہوتی رہے جن کے بغیر کوئی تحریک اور اس کی کوئی علامت محض ظاہری وجود ہے، سید صاحب نے اس بیش قیمت تقریر کے آخر میں جو کہا، وہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ: ''اسلام ایک بلند حوصلہ اور بلند نظر مذہب ہے جس کے لیے ایک مخصوص تربیت کی ضرورت ہے جو اس کے مقتداؤں میں بلندیٔ حوصلہ، استغنائے طبع اور وسعتِ نظر پیدا کرے، وہ اخلاق عالیہ کے بہترین نمونہ ہوں''، سید صاحبؒ نے چلتے چلتے یہ سوال بھی کیا کہ جس قسم کے علماء کی، جس قسم کے نصاب تعلیم کی، جس قسم کی تربیت کی ضرورت پیش کی گئی ہے، کیا وہ حقیقی نہیں؟ کیا ان اصلاحات کی ضرورت نہیں؟ آج صدی گزرنے کے بعد بھی ان سوالوں کی اہمیت اسی طرح برقرار ہے، بس کبھی کبھی ماضی میں جا کر کچھ دیر ہی کے لیے، سہی، اس ماحول میں سانس لینے کی ضرورت ہے، ندوہ کے لیے خواب ہی نہیں دیکھے گئے، فکر و عمل کی ایک دنیا بھی پیش کر دی گئی۔

☆☆☆☆☆

علم ودعوت

# مدارس وجامعات کا بہتر بین تعارف

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

## زندگی کا تعلق صرف جسم سے نہیں

اللہ کا یہ قانون تربیت اور قانون رحمت ہے کہ وہ بیج پھلے اور پھولے گا اور اس کے اندر سے انسانی زندگی کی پرورش کا سامان پیدا ہوگا جو زمین میں ڈالا جائے گا؛ لیکن انسانی زندگی صرف اس جسم کا نام نہیں ہے؛ بلکہ اس سے زیادہ اور اس سے پہلے اس کے دل و دماغ کا نام ہے، تو اگر انسانی جسم کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی مقدار میں اتنا بڑا سامان پیدا کیا ہے کہ جو اگر ہم جیسے انسانوں کی نا قابلیت اور بد دیانتی اور بد نیتی نہ ہو تو ساری دنیا کی پرورش کے لیے بالکل کافی تھا، اگر ہمارے اعمال خراب نہ ہوتے، ہماری نیتوں میں فتور نہ ہوتا، ہم میں اس نعمت کی قدر کرنے کا جذبہ ہوتا۔

## مدرسہ کا نسبی تعلق

تو اللہ تعالیٰ کا جو قانون ہزاروں یا لاکھوں برس سے کام کر رہا ہے، اس کی طرف سے کوئی بخل نہیں ہے، پانی میں کوئی کمی نہیں، غلے اور پھولوں میں کوئی کمی نہیں، اسی طریقہ سے دل و دماغ کی پرورش اور دل کو روشنی اور دماغ کو طاقت پہنچانے کے لیے اور اس کو صحیح رہنمائی عطا کرنے کے لیے اللہ نے نبوت کا سلسلہ پیدا کیا اور اس نبوت نے اسی طریقہ سے انسانی دل و دماغ کو صالح اور صحت مند غذا پہنچائی جس سے دل و دماغ نے صحیح طور پر کام کرنا شروع کیا، نبوت کی انھیں کوششوں کی ایک سنہری کڑی مدرسہ ہے۔

## مدرسہ کا وسیع مفہوم

مدرسہ اپنے وسیع معنی میں یعنی وہ جگہ جہاں اجڈ، بے تربیت اور بد سلیقہ انسان کو جو اپنی فطرت پر ہے اور کچھ نہیں جانتا، اس کو سلیقہ اور زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا جائے، مالک کی پہچان کرائی جائے، اپنی زندگی کے صحیح مقصد سے آشنا کیا جائے اور اس کو بتایا جائے کہ ایک شریف، خدا ترس، خدا سے ڈرنے والا اور خدا کی مخلوق سے محبت رکھنے والا (اجاڑنے، بگاڑنے اور تاراج کرنے والا نہیں) بلکہ اس دنیا کو جنت کا نمونہ بنانے کی کوشش کرنے والا کیسا ہوتا ہے؟ اس کو اس کے لیے کیا ہنر سیکھنا چاہیے؟ اس کے لیے کیا تعلیم حاصل کرنی چاہیے؟ اس کے لیے اپنے نفس پر کس طرح قابو حاصل کرنا چاہیے؟ اس کو کس طرح اپنے نفس کو لگام دینی چاہیے، اور بے لگام جانور کی طرح نہیں چھوڑنا چاہیے؟ اس کے لیے خدا کے پیغمبروں نے علم کا سلسلہ اور علم کا چشمہ جاری کیا۔

Convocation کے موقع پر کسی بڑے دانشور اور کسی بہت پڑھے لکھے انسان کا انتخاب کیا جاتا ہے، جو وہاں سند لینے والوں اور اس جامعہ سے گریجویٹ ہو کر اور اس یونیورسٹی سے فارغ ہو کر نکلنے والوں کو پیغام دے اور اپنی زندگی کے تجربوں کا نچوڑ ان کے سامنے پیش کرے کہ تمہیں کیا بننا چاہیے، اور کیسا بننا چاہیے، جامعہ یا اس یونیورسٹی کا تمہارے اوپر کیا حق ہے، اور اس بستی اور تمہاری جیسی برادری اور اس معاشرہ کا جس سے تم تعلق رکھتے ہو؛ تم سے کیا مطالبہ ہے؟ کیا تقاضا ہے؟ اور تمہارے اوپر اس کا کیا حق ہے؟

اس کے لیے آپ سنتے ہوں گے کہ ہر سال ہر یونیورسٹی کا ایک Convocation ہوتا ہے، تقسیم اسناد کا جلسہ ہوتا ہے، اس میں ملک کے کسی بڑے اونچے درجہ کے کسی پڑھے لکھے انسان کو، کسی فاضل کو، کسی اسکالر کو، کسی Educationist کو بلایا جاتا ہے اور وہ اپنا پیغام دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ آپ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر اور یہاں پڑھ لکھ کر نکلے ہیں تو آپ کو کیا کرنا چاہیے؟ آپ میں کیا صفات اور کیا Qualities ہونی چاہئیں، اور آپ کا کیسا Character ہونا چاہیے؟

## جامعہ کا صحیح تعارف

آج جامعہ کی بنیاد پڑ رہی ہے، جامعہ آباد کی بنیاد پڑ رہی ہے، اور وہ مبارک وقت بھی آئے گا جب یہاں کے طلبہ کو ڈگریاں دی جائیں گی اور سندیں تقسیم کی جائیں گی، یا ہمارے قدیم مدرسوں کی اصطلاح میں ان کی دستار بندی ہوگی اور اس وقت کوئی فاضل آ کر ان کو پیغام دیں گے اور بات کریں گے؛ لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کسی جامعہ کا صحیح الفاظ میں تعارف اور اس کا مکمل تخیل اور اس سے فارغ ہونے والوں کی صفات کا خلاصہ قرآن مجید جیسی کتاب میں (جو لافانی کتاب ہے، جو انسانیت کا صحیفہ ہے، جو قیامت تک باقی رہنے والی ہے، اور جس سے ساری دنیا کو پیغام اور رہنمائی ملی ہے) کیا کسی ایسے جامعہ کا تخیل بھی اس کے اندر پایا جاتا ہے؟ چند لفظوں میں بتا دیا گیا ہو کہ جامعہ کس لیے ہوتا ہے اور اس سے پڑھ کر نکلنے والوں کو کیسا بننا

چاہیے، ان میں کیا صفات ہونی چاہئیں؟ تو میں وہی آیتیں پڑھوں گا جو ابھی قاری نے پڑھیں: "یَایَحْیٰی خُذِالْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ، وَآتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا، وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً، وَکَانَ تَقِیًّا، وَبَرًّا بِوَالِدَیْہِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا" [سورۃ مریم:۱۲-۱۴]، کسی جامعہ کے فارغ اور جامعہ میں داخل ہونے والے کے لیے اس سے بہتر کوئی پیغام اور اس سے بہتر اس کے لیے کوئی خلعت نہیں ہوسکتا جو اس کو پہنایا جائے، اس سے بہتر اس کا کوئی تعارف نہیں ہوسکتا جن لفظوں میں خدا کے اس پیغمبر کا ذکر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "یَایَحْیٰی" (اے خدا کے پیغمبر یحییٰ!)، "خُذِالْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ" (کتاب کو مضبوط پکڑو)۔ سارے جامعہ کا ماحصل اس میں آ گیا کہ کتاب کو مضبوط پکڑنا ہے، آج دنیا میں کیا ہے؟ یا الکتاب نہیں ہے یا قوّت بھی نہیں ہے، یا تو پکڑنے والا ہاتھ ہے یا پکڑنے والی چیز نہیں ہے کہ کس کو پکڑے؟ ان صحیفوں کو پکڑے؟ ان کتابوں، ان پشتاروں اور ان کاغذات کے اوراق کو پکڑے جو ہوا میں پریشان ہیں اور اڑ رہے ہیں؟ "یَایَحْیٰی خُذِالْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ" الکتاب کو پکڑو جو اللہ کی آسمانی کتاب ہے، اور جس سے انسانوں کو ہدایت ملی، اور قیامت تک اسی سے ہدایت ملے گی، "وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَالَہٗ مِنْ نُوْرٍ" [سورۃ النور:۴۰]، (جس کے لیے اللہ ہی روشنی پیدا نہ کرے اس کے لیے پھر کہیں روشنی نہیں ہے)۔ اللہ کی نازل کی ہوئی "الکتاب" خواہ وہ زمانۂ سابق میں توریت اور انجیل کی شکل میں ہو یا اور آسمانی صحیفوں کی شکل میں ہو، جن کا ہم کو صحیح طور پر سب کا نام معلوم نہیں، اور یا وہ اللہ کی آخری کتاب قرآن شریف ہو، اس کو مضبوط پکڑنا ہے، وہی ہے جس سے ساری دنیا میں صحیح علم پھیلا، لوگوں کو خالق کائنات کی بھی، اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی بھی، اور اپنی بھی صحیح شناخت ہوئی اور ان کو صحیح معرفت حاصل ہوئی، اپنی حقیقت بھی پہچاننا بہت ضروری ہے، اگر آدمی اپنی حقیقت نہیں پہچانتا، اپنی زندگی کا صحیح مقصد نہیں جانتا اور اپنے اور خدا کے تعلق کو نہیں جانتا تو وہ کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

## خذ الکتاب بقوۃ کا مفہوم

وہ فرماتا ہے کہ اے یحییٰ! اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑو اور اس طرح پکڑو کہ ہاتھ سے گرنے نہ پائے اور کوئی تم سے چھیننے نہ پائے، اور اس طرح پکڑو کہ اس کو پڑھ کر، ایک مرتبہ سمجھ کر پھر بھولنے نہ پاؤ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "سَنُقْرِئُکَ فَلَاتَنْسٰی" [سورۃ الأعلی:۶] ہم تم کو ایسا پڑھائیں گے کہ پھر تم کہیں بھولنے نہ پاؤ گے، کتنے پڑھنے والے ہیں جو پڑھ پڑھ کر بھول جاتے ہیں، کتنے پڑھنے والے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے پڑھا تھا اس کے خلاف ہی کرتے ہیں، کتنے پڑھانے والے ہیں کہ پڑھا انھوں نے کچھ اور پڑھاتے ہیں کچھ، لیکن جو کچھ پڑھا اس کو یاد رکھے، جو کچھ پڑھا اس پر عمل کرے، جو کچھ پڑھا وہی دوسروں کو دے، جو کچھ صحیح زبان اور صحیح جگہ سے حاصل کیا تھا وہی صحیح طریقہ سے دوسروں تک پہنچائے، یہ سب قوّت کے مفہوم میں شامل ہے۔

"یَایَحْیٰی خُذِالْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ" اے یحییٰ! کتاب کو مضبوط تھامو، مضبوط پکڑو اس طرح کہ پھر تمہارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، جیسے قوموں سے چھوٹ گئی، ملتوں سے چھوٹ گئی، افراد سے چھوٹ گئی، قوموں سے ایسی چھوٹی کہ آج ان قوموں کو ان کتابوں کے نام بھی یاد نہیں اور نہیں بتا سکتے کہ کون سی کتاب ان کو دی گئی تھی، افراد سے اس طرح سے چھوٹی کہ انھوں نے کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھا اس میں کیا لکھا ہے، اور اس کو طاق پر سجا کر رکھ دیا، ہم مسلمان بھی اس کے گنہگار ہیں کہ قرآن مجید ہم کو دیا گیا تھا عمل کرنے کے لیے، لیکن ہم نے اس کو جزدانوں میں سجا کر، اس کو عمدہ سے عمدہ کپڑا پہنا کر اور طاق پر جو طاق نسیاں ہے، اونچے طاق پر اس کو رکھ دیا، (بڑی متبرک کتاب ہے) اور اس کے اوپر گرد جمتی رہی اور ہم نے اس کو کبھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کیا لکھا ہے، ہم نے زندگی میں اس کو منتقل نہیں کیا، ہم نے اپنی زندگی میں اس کا مظاہرہ اور Demonstration نہیں کیا اور ہم نے اپنی زندگی میں اس پر عمل کر کے نہیں دکھایا۔

## قرآن کی عملی تفسیر کی ضرورت

اگر آج ہم مسلمان اپنی زندگیوں میں اس کا نمونہ دکھاتے تو میں یقین کرتا ہوں کہ آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا! آج خود ہمارے ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، کیسی محبت ہوتی، کیسی دیانتداری ہوتی، کیسا فرض کا احساس ہوتا، کیسے ملک کی خدمت کا جذبہ ہوتا، کیسے خدا کی معرفت گھر گھر عام ہوتی، سب اس دنیا کے اور اس ملک کے رہنے والے اپنے معبود کو پہچانتے، انسان کا مرتبہ پہچانا جاتا، اگر اس کتاب پر اپنی زندگیوں میں عمل کر کے ہم مسلمان دکھاتے تو سب کو معلوم ہوتا کہ انسان کا کیا مرتبہ ہے، انسان کیسی قیمتی چیز ہے، انسان خدا کا کیسا پیارا ہے، "وَآتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا" (اور ہم نے اس کو بچپن ہی میں حکمت دی)، اب اگر خدا کسی کو حکمت دیتا ہے اور اس کا سینہ کھولتا ہے،

اس کو علم لدنی حاصل ہوتا ہے تو سبحان اللہ! لیکن ہر ایک کی قسمت کہاں! اس لیے ایسے مدرسے قائم کیے جاتے ہیں، یہاں سے ابتدائی مدرسوں کی بنیاد پڑی "وَآتَيْنَهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا"۔

## اہل مدارس کا باطن کیسا طرح ہونا چاہیے

اور پھر اس کے بعد پڑھ لکھ کر بے درد بننا نہیں ہے، ظالم بننا نہیں ہے، انسان کا شکاری بننا نہیں ہے، کام چور، غلہ چور اور دولت چور بننا نہیں ہے، بلکہ پڑھ لکھ کر اور محبت بڑھنی چاہیے، پڑھ لکھ کر دل سے انسانوں کی محبت کے چشمے ابلنے لگیں اور دل کو موم کی طرح پگھلنا چاہیے، دل کو پتھر نہیں ہونا چاہیے بلکہ موم ہونا چاہیے، فولاد نہیں ہونا چاہیے، فولاد ہونے کا موقع وہ ہے کہ جب کوئی بہت اہم مقصد ہو، ورنہ دل کو تو ریشم بننا چاہیے، دل کو تو بہتے ہوئے پانی کی طرح ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا" ہم نے اپنی طرف سے اس کے دل میں محبت کا چشمہ بہایا، محبت کا چشمہ ابلنے لگا، ہر ایک پر ترس کھانا، ہر ایک کے لیے آنسو بہانا، ہر ایک کا غم اپنا غم بنا لینا، ہر ایک کے لیے تڑپنا، ہر ایک کے لیے پگھلنا اور سلگنا، ہر ایک کے لیے جلنا اور ہر ایک کے غم میں گھلنا، یہ ہر پڑھے لکھے انسان کا شعار اور Moto ہونا چاہیے، کہ وہ جب کسی انسان کی مصیبت دیکھے تو اس کا دل پگھل جائے، اس کی آنکھ سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگے اور وہ تڑپ کر مر جائے، اس کو کھانے میں مزہ نہ آئے، پینے میں مزہ نہ آئے، جیسے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے کہ جب قیدی آئے جنھوں نے آپ کے اوپر تیر چلائے تھے، جنھوں نے آپ پر پتھر برسائے تھے، جنھوں نے آپ کو گالیاں دی تھیں، جنھوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، جنھوں نے آپ کے ساتھ وہ سلوک کیا تھا جو کوئی کسی خونخوار جانور کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا، جب وہ قید ہو کر آئے تو رات بھر آپ کو نیند نہ آئی کہ ان بیچاروں کے ہاتھ پاؤں پر ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، کسی کی کراہ سن لی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بے قرار ہو جاتے تھے، اور اگر نماز میں (کہ جس سے بڑھ کر کے کوئی آپ کے لیے محبوب مشغلہ نہیں تھا، فرماتے تھے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، [مسند احمد] لیکن کسی بچہ کا رونا سن لیتے تھے تو جلدی نماز ختم کرتے تھے کہ معلوم نہیں کہ اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی، [صحیح بخاری] وہ نبی رحمت جس کی رحمت ومحبت کا یہ حال تھا، اس کے نائبین جو علماء، فضلاء، جامعہ سے نکلنے والے اور مدارس سے فارغ ہونے والے ہیں ان کا دل کیسے سخت ہوسکتا ہے؟ فرمایا: "وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً"۔

## پاک دل وپاکباز

ہاں اپنی طرف سے ہم نے اس کو محبت وشفقت دی، ترس کھانا سکھایا، پاکی اور ستھرائی دی، اس کے اخلاق پاکیزہ، اس کا جسم پاک، اس کے کپڑے پاک، اس کے ارادے پاک، اس کی نیتیں پاک، اس کے کام پاک، یہ لفظ "زکوۃ" سب کو شامل ہے: "وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً"، وہ سراپا پاکی تھا، وہ مجسم پاکی تھا، "وَكَانَ تَقِيًّا" وہ چالاک نہیں تھا، وہ مال حاصل کرنے اور دولت بڑھانے کے نئے نئے اور ہوشیاری کے طریقے نہیں جانتا تھا، بلکہ "وَكَانَ تَقِيًّا" اس کے اندر احتیاط تھی، اس کے اندر ہر ایک کا خیال تھا، کسی کو تکلیف نہ پہنچنے پائے اور کسی کا حق نہ مارا جائے، "وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ" اور اپنے ماں باپ کا بڑا فرماں بردار، بڑا سپوت، ان کا بڑا خدمت گزار اور اطاعت شعار، "وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا" اور وہ بہت سختی کرنے والا، نافرمان، سرکش، ضدی، ہٹ دھرم اور مغرور نہیں تھا۔

## مدارس وجامعات کے لیے بہترین چارٹ

یہ جامعہ کے فارغ کا اور اس کے مقاصد کا بہترین سراپا ہے، بہترین حلیہ اور بہترین نقشہ ہے، بہترین تعارف اور بہترین چارٹ ہے۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ایک جامعہ بننے والی ہے، اس میں ہم چاہتے ہیں کہ ایک چارٹ لگائیں کہ اس جامعہ کے فضلاء، وہاں کے اساتذہ اور وہاں کے طلبہ کے کیا اخلاق ہونے چاہئیں؟ تو میں یہ آیت دوں گا کہ اس آیت کو بہت سنہرے حروف سے خوشخط لکھ کر اور اس کا ترجمہ کروا کر اس جامعہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا جائے: "يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ، وَ آتَيْنَهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا، وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً، وَكَانَ تَقِيًّا، وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا"۔

اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ جامعہ کے پڑھنے والے اور جامعہ سے پڑھ کر نکلنے والے ان اخلاق وصفات کے حامل ہوں اور وہ دنیا میں نمونہ پیش کریں، یہ بستی نور کی بستی ہو، برکت کی بستی ہو، رحمت کی بستی ہو، علم وعرفان کی بستی ہو، یہاں سے علم کے دھارے اور علم کے چشمے بہیں اور اس بستی کے آس پاس کو ہی نہیں بلکہ دور دور کے شہروں کو، دیہاتوں کو، جنگلوں کو، اور پورے ملک کو اور ملک سے باہر نکل کر دوسرے ملکوں کو سیراب کریں، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور آج کے دن کو ہر طرح سے ہمارے اور آپ کے حق میں مبارک فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

دین و علم

# دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

مسلمانوں میں اس وقت ان کے ہر ملک میں تعلیم کی اہمیت کو اچھا خاصا محسوس کیا جانے لگا ہے، اس کے مسائل اور تقاضوں پر غور کرنے کے لیے مسلمانوں کے دانشور اور باشعور افراد کے مشاورتی اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں ،اور ضرورت کے احساس کے ساتھ علمی تدابیر بھی اختیار کی جاتی ہیں، اس کی وجہ سے مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے تعلیم کا انتظام کرنے کا رجحان عام ہو گیا ہے، اگر چہ مطلوبہ مقدار اور ضرورت کے لحاظ سے یہ ابھی کم ہے؛ لیکن جتنا ہے وہ ایک فال نیک ہے۔

آزادی سے قبل تعلیم کی ضرورت کو اس اہمیت اور وسعت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، برطانوی اقتدار کے تحت زیادہ تر کلرک اور آفیسر سطح کے افراد تیار کرنے کو اہمیت دی جاتی تھی، زندگی کو ہمہ جہتی ترقی دینے کی ضرورت کے لیے تعلیم کی افادیت کو عموماً نظر انداز کیا جاتا تھا، آزادی کے بعد ہنر مند افراد تیار کرنے کی ضرورت کو بہت محسوس کیا جانے لگا اور مضامینِ تعلیم میں نسبتاً سائنس کے شعبوں کی طرف توجہ بڑھی اور سائنس کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو اختیار کیا گیا۔

مسلمانوں کی تعلیم کے مختلف عناصر میں ایک بڑا اور بنیادی عنصر دینی تعلیم کا رہا ہے، اس کو مسلمانوں نے آزادی سے قبل بھی اس کا مقام دینے کی کوشش کی اور اس سے تیار ہونے والے افراد نے ملت کی دینی ضرورت کو خاصی حد تک پورا کیا اور ان میں سے ایک تعداد نے آزادی کی جنگ میں بھی نمایاں حصہ لیا اور قربانیاں دیں پھر آزادی کے بعد بھی یہ دینی تعلیم قائم رہی بلکہ اضافہ ہوا ،دینی علوم کے مدارس اور جامعات مزید قائم کیے گئے اور قائم کیے جارہے ہیں، اور وہ قوم کو اس کی دینی ضرورت کے افراد ایک حد تک مہیا کر رہے ہیں۔

تعلیم کے مادی اور خالص دنیاوی عناصر کی اہمیت کا زیادہ احساس رکھنے والے کچھ افراد دینی علوم کی تعلیم کے بندوبست کو زائد از ضرورت انتظام قرار دیتے ہیں یہ لوگ دراصل دینی تعلیم کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں رکھتے ،مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے اور ان میں اسلامی واقفیت اور صلاحیت پیدا کرنے کے لیے یہ دینی علوم کی درسگاہیں بنیادی کردار انجام دیتی ہیں، ان کو امت کی دینی ضرورت کے لحاظ سے دیکھنا چاہیے؛ لیکن افسوس یہ ہے کہ عہد جدید کے مسلم تعلیم یافتہ طبقہ کا مغربی فکر وتہذیب کے اثر نے ایک طرف یہ ذہن بنایا کہ وہ دین کو انسان کا صرف ایک ذاتی مسئلہ اور ایک کم اہمیت کا ایسا معاملہ سمجھنے لگے کہ وہ رہے یا نہ رہے اس سے انسانی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، حالانکہ مسلمان قوم کے لیے اس کا دینی عقیدہ اس کے تحت عملی زندگی ان کے لیے بنیادی حیثیت کا مالک ہے اس طرح مدارس دینیہ دینی تقاضہ اور ضرورت کے تحت جو کام انجام دے رہے ہیں مسلمان کی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مدارس کی اس اہمیت کا خود مغربی طاقتوں نے اندازہ لگا لیا ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ دین کی پابندی انسان میں واقعتاً یک خاصی افادیت پیدا کر دیتی ہے چنانچہ وہ اس زاویہ نگاہ سے مسلمانوں میں ابھرتے ہوئے دینی شعور کو ایک ابھرتی طاقت محسوس کرنے لگے ہیں جس کو وہ اپنی بے دینی کی زندگی اور بے حیا اور گمراہ فکر وتہذیب کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کے مدارس دینیہ کو اپنی دشمن اسلام تہذیب کے لیے مضر سمجھتے ہیں ؛ کیونکہ ان کے نزدیک ان مدارس سے ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو کہ مغربی دنیا کی ملحدانہ کیفیت اور اخلاقی بے باکی اور حیا سوزی وشخصی کردار کی آزادی کے لیے مخالف اثرات رکھنے والے، اور ان کا مقابلہ کرنے والے ہیں افسوس کی بات ہے کہ ہمارے مغرب زدہ مسلمان دانشور بھی دینی مدارس کے مفید اثر کو نظر انداز کر کے مغرب منفی کے خیال میں اس کے ہمنوا بن جاتے ہیں، ہمارے یہ دینی مدارس تین طرح کے ہیں، ایک ابتدائی مدارس جن کو مکاتب کا نام دیا جاتا ہے یہ عموماً درجہ پانچ تک ہوتے ہیں ان میں اردو ،قرآن مجید ناظرہ اور اچھی اخلاقی، دینی اور تہذیبی باتیں جو بچوں کی سمجھ کے مطابق ہوتی ہیں پڑھائی جاتی ہیں، ساتھ ساتھ کچھ حساب اور ہندی کی حرف شناسی بھی سکھائی جاتی ہے، ان کا معیار حکومتی پرائمری درجات کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ نصابِ تعلیم مسلمان بچوں کے لیے عقیدہ و مذہب کے لحاظ سے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے جو مسلمان بچے محروم رہتے ہیں وہ اپنے دین و مذہب سے واقفیت میں بالکل کورے رہ جاتے ہیں، پھر اگر ان کو غیر اسلامی ماحول ملے تو وہ اسلام سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔

ان ہی دینی مکاتب میں بعض جگہ تین سال کا حفظ قرآن کا کورس بھی شامل کر دیا جاتا ہے جس سے بچے حافظ قرآن بن جاتے ہیں اور ان سے امت اسلامیہ کی حفظ قرآن کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے جو اپنی جگہ پر ایک اہم ضرورت ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

مکاتب کی یہ تعلیم کم از کم حفظ قرآن سے پہلے تک ہر مسلمان بچے کے لیے ضروری ہے۔

مدارس اسلامیہ کا دوسرا مرحلہ ثانوی اور اس سے اوپر کی دینی تعلیم کا ہے جس میں دینی علوم اس حد تک پڑھائے جاتے ہیں کہ امت کی دینی ضرورت کو پورا کرنے والے افراد تیار ہوں ان میں مفتی ہیں، خطیب و واعظ ہیں، معلم ہیں، داعی ہیں، مصنف و محقق ہیں، یہ تفسیر قرآن اور فقہ و حدیث سے اتنی واقفیت حاصل کرتے ہیں جس سے وہ اپنی امت کی دینی ضرورت پوری کر سکیں، ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے عصری تعلیم میں کوئی میڈیکل لائن میں جا کر مریضوں کے علاج کی ضرورت پوری کرنے کے قابل بنتا ہے، اور کوئی انجینئرنگ لائن میں جا کر زندگی کی صنعتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور کوئی قانون کی تعلیم حاصل کر کے لوگوں کے جھگڑوں اور نزاعات میں مقدمات کی ذمہ داری انجام دیتا ہے، اسی طرح مسلمان کی شرعی و دینی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے عالم دین بننا ایک ناگزیر ہوتی ضرورت ہے، دینی تعلیم کے نصاب میں تفسیر و فقہ و حدیث اہم اور خاصی مقدار رکھنے والے اجزاء ہوتے ہیں جس کے لیے دینی طالب علم کو ذرا تفصیلی طریقہ سے کئی سال لگانے ہوتے ہیں ہماری اس دینی ضرورت کو پورا کرنے والی درس گاہیں ہماری دینی زندگی کے بقاء و حفاظت کے لیے ضروری ہیں اور یہ درس گاہیں عصری مضامین کی درس گاہوں کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے دس فی صد بھی نہیں ہیں اور ان کے طلبہ کی تعداد کو دیکھا جائے تو ان دینی درس گاہوں میں جانے والے طلبہ کی تعداد دیگر مضامین کی درس گاہوں میں جانے والے طلبہ کے مقابلہ میں صرف تین یا چار فی صدی نکلے گی تو کیا ہماری دینی و اسلامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس کے اہل علم کی یہ تعداد زندگی کی عام ضروریات کے لیے تیار کی جانے والی ۹۱-۹۲ فیصد تعداد کے مقابلہ میں گوارہ نہیں کی جا سکتی ہیں، امت کی خیر خواہی رکھنے والا کوئی دانشور بھی اس بات سے انکار نہ کر سکے گا کہ دینی و اسلامی احکام و قدروں کی حفاظت کے لیے یہ ازبس ضروری ہیں، لیکن صحیح جائزہ نہ لینے کی وجہ سے دینی ضرورت کے انتظام کو زائد از ضرورت سمجھا جا رہا ہے، جبکہ عملی طور پر اس کی مقدار ضرورت سے کچھ کم ہی ہے، اگر اس محدود انتظام کو اور مزید کم کر دیا جائے یا اس کو دنیاوی ضرورت کے انتظام میں ضم کر دیا جائے تو ہم کو اسلام کی مذہبی تعلیمات سے واقف کرانے والے اور مذہبی احکامات اور مذہبی اعمال کی طرف متوجہ کرنے والے نیز احکام الٰہی کے بتانے والے جن کی رہنمائی میں مسلمان مسلمان رہنے کا طریقہ سیکھے، صوم صلوٰۃ، زکوٰۃ و حج نیز پیدائش اور موت، شادی و غمی ان سب میں مسلمان کے فرائض بتانے والے مطلوبہ ضرورت کے بقدر بھی نہ مل سکیں گے، ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگ جو آخرت پر اور اس میں پیش آنے والے حالات پر یقین نہیں رکھتے وہ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ کیا فرق پڑتا ہے مرنے والا جلایا جائے یا بلا غسل و نماز جنازہ دفن کر دیا جائے، کیا فرق پڑتا ہے قاضی نہ ملے تو ''سول میرج'' سے کام چلا لیا جائے، کیا فرق پڑتا ہے نماز پڑھنا اور اس کے احکام جاننا، رمضان و عید کے بارے میں واقفیت ہونا آئے یا نہ آئے کیا فرق پڑتا ہے آدمی کو اپنی جوانی اور ادھیڑ عمر میں راحت و عزت ملے یہ کافی ہے مرنے کے بعد کیا ہوگا دیکھا جائے گا تو آخرت پر یقین نہ رکھنے والے ایسا کہہ سکتے ہیں اور دینی تعلیم کی اہمیت کو کم کر سکتے ہیں؛ لیکن جو افراد دنیا وی ضرورت کی اہمیت کو مانتے ہوئے آخرت میں پیش آنے والے معاملات پر بھی دھیان دینا ضروری سمجھتے ہیں وہ تو اس کے لیے تیار نہیں کہ ہم دنیا کی تو پوری فکر کریں اور آخرت کی راحت اور عزت کو ناقابل توجہ سمجھیں، ہم کو تو اپنی دینی ضرورت کو بھی دیکھنا ہے اور اس کی مقدار کے لحاظ سے انتظام بھی کرنا ہے، اس طرح اگر سو طالب علموں میں صرف تین چار طالب علم دینی تعلیمات کے حصول کی طرف جاتے ہیں تو ان

کا راستہ روکنا یا دین کی ضرورت کو غیر اہم سمجھ کر دوسری ضرورتوں کا تابع کر دینا صحیح قرار نہیں دے سکتے۔

امت اسلامیہ کی زندگی کے دونوں پہلوؤں یعنی دنیاوی ضروریات اور آخرت کی سلامتی اور کامیابی کی ضرورت کو پیش نظر رکھنا امت مسلمہ کے ذمہ دار طبقہ کی ذمہ داری ہے، امت کی طبی ضرورت کے لیے کتنے آدمی چاہئیں، انتظامی ضرورت کے لیے کتنے کار پرداز چاہئیں، سیاسی ضرورت کے لیے اور سماجی کاموں کے لیے کتنے افراد چاہئیں، قانونی تقاضوں کے لیے کتنے ماہرین کی ضرورت ہے، اسی طرح ہماری دینی اور اخلاقی ضرورت کے لیے کتنے واقف کاروں اور ذمہ داری سنبھالنے والوں کی ضرورت ہے، یہ سب ضرورتیں ہمارے پیش نظر ہونا چاہئیں، مقدار اور تعداد کا اندازہ لگانے میں فرق ہوسکتا ہے لیکن کسی اہم پہلو کو نظر انداز کر دینا صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔

لہٰذا ہمارے دینی مدارس جو ابتدائی تعلیم کے مکاتب کی شکل میں ہوں وہ تو اتنی تعداد میں رہنے چاہئیں کہ امت کے تمام بچے ان سے مستفید ہوسکیں اور وہ مدارس جن میں عالم و فاضل بننے کی سطح تک تعلیم کا انتظام ہو وہ اس کی ضرورت کے مطابق قائم کیے جانے اور باقی رکھے جانے ضروری ہیں، اس میں امت کے تمام طبقوں اور دانشوروں کو ساتھ دینا اور تعاون کرنا چاہیے، یہ امت کے مقام اور کردار کو معیاری بنانے اور اس کو اس کے شایان شان حیثیت تک اٹھانے کے لیے ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

## حق غالب ہو کر رہے گا

مولانا مجیب اللہ ندویؒ

عام فتنہ وفساد اور معاشرہ کے عام بگاڑ کے وقت آدمی کا اپنے دین کو بچالے جانا بھی بڑا کام ہوتا ہے اور حدیث میں اس کی اجازت آئی ہے؛ لیکن بہر حال یہ رخصت کا پہلو ہے، عزیمت یہی ہے کہ حق کی جو دولت اسے فضل ایزدی سے ملی ہے، اس کو اپنے ہی تک محدود رکھنے کے بجائے دوسروں میں بھی تقسیم کرے، اس کو چھپانے کے بجائے زندگی کے میدان میں آکر اس کی دعوت دے، دین کی جو روشنی اس کے ہاتھ آئی ہے، اس سے اپنی ہی آنکھیں روشن نہ کرے، بلکہ جو لوگ باطل کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں سراسیمہ و سرگرداں ہیں، ان کے ہاتھوں تک بھی یہ روشنی پہنچائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ ان کو سو شہیدوں کے برابر اجر ملے گا، اور یہی لوگ ہیں جن کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: میری امت میں ہمیشہ کچھ ایسے لوگ موجود رہیں گے جو حق کو غالب کرنے کے لیے جد وجہد کرتے رہیں گے، ان کو اس بات کی پرواہ نہ ہوگی کہ کس نے ان کو چھوڑ دیا، اور کون ان کی مخالفت کر رہا ہے، یہ گروہ قیامت تک اپنا کام کرتا رہے گا۔

☆☆☆


## Declaration Of Ownership & Other Details

### Form-4 Rule-8

| | |
|---|---|
| Name Of Paper: | Tameer-e-Hayat |
| Place Of Publication: | Lucknow |
| Periodicity Of Publication : | Fortnightly |
| Cheif Editor: | Shamsul Haque Nadwi |
| Nationality: | Indian |
| Address: | Campus Darul Uloom Nadwatul Ulama, Tagore Marg, Lucknow U.P. INDIA |
| Printer & Publisher : | Mohammad Taha Athar |
| Nationality: | Indian |
| Address: | 21, Adnan Palli, Near Hira Public School Ring Road, Dubagga Kakori, Lucknow. |

I Mohammad Taha Athar Printer, Publisher Declare That The above information Is correct To the best of knowledge and belief.

Mohammad Taha Athar

فکر معاصر

# امت مسلمہ کا فرض منصبی اور اس کے اثرات

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

یہ امت صاحب پیغام امت ہے، اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر امت کا خطاب ملا ہے، اس کی متعدد خصوصیات کی طرف قرآن وحدیث میں واضح اشارے آئے ہیں، اس امت نے ابتدائی دور میں اپنے اولین حاملین کی قیادت میں ایسا انقلاب برپا کیا کہ خیر وشر کے پیمانہ بدل گئے، اور انسانیت کو نئی زندگی مل گئی، اور نصف صدی کے تھوڑے عرصہ میں دنیا کے بے شمار علاقے فتح ہو گئے اور وہ اسلامی قلمرو میں داخل ہوگئے، خلافت امیہ، عباسیہ، عثمانیہ وغیرہ خلافتیں اسی کا تسلسل اور امتداد تھیں، لیکن حسرت وافسوس کے ساتھ یہ بات لکھی جارہی ہے کہ وہ خلافت عثمانیہ جو اس امت کی تاریخی عظمت کی شاندار روایت تھی، پوری عیاری سے اس کی قبا چاک کردی گئی، اور بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ: ''نہیں معلوم کہ امت مسلمہ کب تک اس کے نقصانات کو برداشت کرتی رہے گی''۔ اس طرح تسبیح کے دانوں کی طرح مربوط مسلم ممالک انتشار کا شکار ہوگئے، اور چھوٹی چھوٹی نوآبادیات قائم ہوگئیں، برطانوی سامراج نے اس کا فائدہ اٹھایا، اور ان پر اپنا عسکری تسلط برقرار رکھا، عسکری حملوں کے ساتھ فکری یلغار کے ذریعہ بھی وہاں کی نسلوں کے ذہنوں کو مسموم اور زہر آلود کیا، نصابِ تعلیم کو بدلا، یورپین وفود بھیجے، عیسائی مشنریاں متحرک ہوئیں، اور استشراقی مزاج آگے بڑھا، اور مستشرقین کی ایک بڑی تعداد وجود میں آگئی، یہ سب اسی لیے ہوا کہ امت مسلمہ جو صاحب پیغام امت ہے، اس کے جذبۂ اندرون کو سرد کردیا جائے، اور روح انقلاب پر ضرب کاری لگادی جائے، کیونکہ پورے ابلیسی نظام کو اس عہد انحطاط میں بھی اگر کوئی خطرہ کسی ذات یا جماعت سے ہے تو وہ امت مسلمہ ہے۔

تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ جب تک یہ امت اپنے اصل مشن پر گامزن رہی، اور نبوی تعلیمات پر عمل کرتی رہی، دنیا پر اس کی حکمرانی قائم رہی، اقوام عالم اس کے زیر نگیں باقی رہیں، کیا مشرق، کیا مغرب ہر طرف اس کا جھنڈا لہراتا رہا، اور خیر خواہی، محبت وہمدردی، اخلاص وتعاون کا جذبہ فروغ پاتا رہا، معنوی اور مادی لحاظ سے ترقیات کا سیل رواں جاری ہوا، جو انسانیت کے لئے نفع بخش ثابت ہوا، لیکن جب یہ قوم اپنے مقصد حیات کو بھول گئی، اور دوسری قوموں کے تابع ہوگئی، تو نہ صرف اس نے اپنا وجود کھودیا، بلکہ دنیا کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہونچا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" میں اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا، اور حقائق اور تاریخی واقعات کی روشنی میں اس پہلو پر بحث کی ہے کہ دنیا کی ترقی مسلموں کی ترقی سے وابستہ ہے، اور دنیا کی تنزلی مسلمانوں کی تنزلی سے مربوط ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امت آج سے چودہ سو سال پہلے صرف پانچ افراد میں محدود تھی: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، پھر رفتہ رفتہ وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ایک لاکھ چوبیس ہزار، بلکہ اس سے بھی متجاوز تھی، اور اِس وقت چھ ارب دنیا کی آبادی میں ڈیڑھ ارب سے زائد افراد امت مسلمہ کے زمرہ میں شامل ہیں، اور روز افزوں اس میں اضافہ ہورہا ہے، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں، جبکہ عیسائی آبادی چند براعظموں میں محدود ہے، دوسری خصوصیت یہ کہ ان کے پاس معدنیات سے لبریز ذخایر ہیں۔

ویسے تو دنیا کی تقسیم ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور غریب ممالک سے کی گئی ہے، لیکن اس کے علاوہ دو تقسیمیں اور ہیں، جن میں ایک عالم عربی، دوسری عالم اسلامی، عالم عربی کے تقریبا بائیس ممالک ہیں، جن کا اتحاد منظمة التعاون الاسلامی (او، آئی، سی) یا جامعة الدول العربية (عرب لیگ) وغیرہ کے ذریعہ کسی حد تک قائم ہے، لیکن عالم اسلام کے زمرے میں تقریبا ۵۸/ممالک ہیں، جو سرکاری اعداد وشمار میں مسلم شمار کیے جاتے ہیں، ان کے علاوہ دیگر جمہوری ممالک میں مسلمان اقلیتوں کی ایسی معتد بہ تعداد موجود ہے، جو کئی اسلامی ملکوں کے برابر ہے۔

اسلام مخالف طاقتوں کو اس حقیقت کا ادراک بہت پہلے ہوگیا تھا، چنانچہ انہوں نے عسکری اور

فکری دونوں محاذوں پر مسلمانوں کی اجتماعیت کو ختم کرنے ،اوران کے اندر بزدلی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، صلیبی جنگوں کا طویل تسلسل ،فکری یلغاروں میں سیکولرازم ،مغربیت ،قومی و اقلیمی تہذیبوں کا احیاء،عربی زبان کے رسم الخط کی تبدیلی اور عامی زبانوں کو رواج دینا،خطرناک رسائل کی نشر و اشاعت ، قادیانیت ، بابیت ، بہائیت ، استشراق ،مشنری تحریکات وغیرہ متعدد عنوانات سے عالم اسلام کے خلاف متنوع سرگرمیاں جاری رہیں،اوراب بھی مختلف سطح پر یہ سلسلہ قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت وصیانت کے لیے ابتدا ہی سے دو مستحکم انتظامات فرمائے ہیں: ایک کتاب اللہ،دوسرے رجال اللہ،کتاب اللہ سے مراد وہ آسمانی تعلیمات جن پر عمل کر کے انسانیت صحیح راستہ پر قائم رہ سکتی ہے ، یہ آسمانی تعلیمات قرآن کریم کے مطابق صحیفۂ ابراہیم،تورات ،زبور، انجیل اور قرآن کریم کی شکل میں اتاری گئیں،ان سے انسانیت نے راہِ نجات حاصل کی اور منزل مقصود پر گامزن رہی،حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انبیاء کرام کو سو صحیفے اور چار آسمانی کتابیں دی گئیں ،تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا بنیادی عقائد کا حصہ ہے،اس کے بغیر ایمان مکمل ہی نہیں ہوسکتا،قرآن کریم کے پہلے پارے میں ہے کہ ایمان والے وہ ہیں،جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی کتاب ( قرآن کریم ) پر ایمان لاتے ہیں ، اور اور سابقہ کتابوں پر بھی ایمان لاتے ہیں،اور آخرت کو دل و دماغ سے تسلیم کرتے ہیں:"وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ، وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ"[البقرۃ:۴]۔

ہدایت ورہنمائی کا دوسرا ذریعہ انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام ہیں،جن کو اللہ تعالیٰ نے تاریخ کے ہر عہد میں بھیجا،قرآن کریم میں ہے:" وَاِنْ مِّنْ أُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْر" [فاطر:۲۴]ہر قوم میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسولوں کے بھیجنے کا سلسلہ قائم فرمایا، جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہے،اور صحیح راستہ دکھاتے رہے،بیہقی کی روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام اس روئے زمین پر آئے ،جن میں صحیح حدیث کے مطابق تین سو تیرہ رسول تھے،قرآن کریم میں پچیس انبیاء کرام کے نام صراحت کے ساتھ موجود ہیں: آدم ،نوح ،ھود ، صالح ، ابراہیم ، لوط ،شعیب ، ادریس،اسماعیل،اسحاق،یعقوب،یوسف،ایوب، یونس،موسیٰ،ھارون،داود،سلیمان،الیاس،زکریا، یحییٰ ،ذوالکفل،الیسع،عیسیٰ،محمد،ان میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں،آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، کیونکہ نبوت کا سلسلہ بند ہو گیا؛لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے صحابہ کرامؓ اوران کے بعد تابعین وتبع تابعین، نیز ہر دور میں علماء کرام کو انبیاء کا وارث قرار دیا،حدیث شریف میں آیا ہے: ان العلماء ورثة الأنبياء [سنن ابوداود] اور یہی علماء ربانیین ،اور داعیان اسلام ہیں ،جنہوں نے ہر دور میں دین کو دنیا کے کونے کونے میں پہونچایا،اور اسلام کی تبلیغ کا حق ادا کیا،رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دور میں انصاف پسند افراد کے دنیا میں موجود رہنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين ، و تأويل الجاهلين (ہر دور میں اس علم نبوت کے وارث ایسے افراد ہوں گے جو دین سے غلو پسندوں کی تحریفات، باطل پسندوں کی غلط بیانیوں اور جاہلوں کی بیجا تاویلات کو کھرچ کھرچ کر پھینکتے رہیں گے )[سنن بیہقی بروایت ابراہیم بن عبدالرحمٰن عذری]

دعوت وعزیمت کی تاریخ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ایسے علماء حق کے بھیجنے کا فیصلہ فرمایا ، جنہوں نے فتنوں اور آزمائشوں سے بھرے ہوئے ماحول میں صدائے غیبی کو عوام و خواص تک پہونچانے کا عزم کیا، اوراس میں وہ کامیاب رہے ، میرے مرشد و مربی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے زمانۂ نبوت کے بعد سے اپنے دور کی تاریخ دعوت و عزیمت لکھ کر اس دعوی کو حقائق اور واقعات کی روشنی میں واضح کر دیا ہے ، حضرت عمر بن عبد العزیز ، حضرت حسن بصری ، حضرت امام احمد بن حنبل ، امام غزالی ، شیخ عبد القادر جیلانی ، سلطان صلاح الدین ایوبی ، شیخ جلال الدین رومی ، علامہ ابن تیمیہ ، حضرت نظام الدین اولیا ، حضرت شاہ معین الدین اجمیری ، شیخ شرف الدین یحیی منیری ، حضرت مجدد الف ثانی ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت سید احمد شہید اور ان کے خلفاء و منتسبین کے جامع اور مفصل تذکرے تاریخ دعوت وعزیمت میں موجود ہیں ، اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہر دور میں پائے جاتے رہے اور دین حق کی ترجمانی، نیز اس کی نشر واشاعت کا فریضہ انجام دیتے رہے ،جن سے لاکھوں بندگان خدا کو فیض پہونچا اور ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے۔.....

.....بقیہ صفحہ ۲۶ پر

یقین محکم

# اسلامی تشخص اور اسلامی شناخت کی ضرورت

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

معاصر میڈیا کی حیثیت اس کے مالکوں کے حق میں ایک مدد ومعاون کی ہے وہ مخالفین کے لیے تیشہ سے کم نہیں، تمام ذرائع نشر واشاعت اپنے مالکوں کے مفادات ومنافع کے مطابق اچھے کو برا اور برے کو اچھا بنا کر پیش کرنے میں مصروف ہیں اور شخصی مصالح کی حفاظت اور ذاتی مفادات کو بروئے کار لانے کے لیے اخلاق تو اخلاق انسانی قدروں کو بھی پامال کیا جارہا ہے۔

پندرہویں صدی ہجری سے پہلے عالمی میڈیا نے یہ زبردست پروپیگنڈہ کیا کہ نئی صدی اسلام کی صدی ہوگی، اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے تعلق سے یہ اشتعال انگیز تصور اتنا فروغ پایا کہ پورا یورپ اسلام سے لرزنے لگا اور اس کے مقابلے کے لیے تیاری کرنے لگا۔

عالمی میڈیا نے اشتراکیت کو چھوڑ کر اسلام کے خلاف محاذ قائم کرکے عالم اسلام میں رونما ہونے والے واقعات وحوادث کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے پر پوری توجہ صرف کرنا شروع کردی، حالانکہ دوسری قوموں میں رونما ہونے والے دہشت گردانہ واقعات کا تناسب زیادہ ہے، خود یورپ میں کثرت سے انتہا پسندانہ اور دہشت گردانہ واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن میڈیا کو کوئی جنبش نہیں ہوتی، لیکن اس کے مقابلہ میں عالم اسلام میں اگر کوئی چھوٹا واقعہ بھی پیش آجائے تو مغربی میڈیا اس کو انتہائی بھیانک شکل میں پیش کرتا ہے، اور اسلامی تنظیموں کی سرگرمیوں کو مائکرواسکوپ سے دیکھ کر مسخ کرکے پیش کرتا ہے۔ ایسی رپورٹیں شائع کی جاتی ہیں جن میں پروپیگنڈہ، دجل وفریب، جعل سازی کی چھاپ غالب ہوتی ہے۔ اسی عرصہ میں ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی تو عالمی میڈیا نے اس پر بھرپور توجہ دی جیسے وہ کوئی مقدس کتاب ہو اور اس کی معلومات ایسی صحیح اور مسلم ہوں جس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

اسلامیت ومغربیت کی کشمکش اور اس کے ذرائع دفاع کا پتہ لگانے کے لیے کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اور دوسری طرف کسی نے مطلق توجہ نہ دی کہ اسلامی تہذیب ہی وہ معاشرتی تہذیب ہے جس کی کوئی حکومت حامی ومعاون نہیں جب کہ مغربی تہذیب کی حفاظت کرنے والی ایسی بے شمار حکومتیں ہیں جو طاقت و قوت سائنس وٹکنالوجی اور ابلاغ کے وسائل سے لیس ہیں لیکن میڈیا نے اسلامی تہذیب کو عالمی خطرہ کی شکل میں پیش کیا جس سے بڑی حکومتوں کے وجود کو خطرہ لاحق ہوگیا بلکہ پورا یورپ لرز اٹھا میڈیا کے اسلامی خطرہ کو سنگین بنا کر پیش کرنے کی وجہ سے دنیا کے مختلف حصوں میں قتل وغارت گری کے واقعات رونما ہوئے جن میں مسلمانوں کا بڑا جانی ومالی نقصان ہوا ان پر پابندیاں عائد کی گئیں اسی پروپیگنڈہ کی وجہ سے ''سویت یونین'' کی سابق اسلامی جمہوریتوں میں مسلمانوں کو وہ آزادی نہ مل سکی جو غیر مسلم ملکوں کو حاصل ہوئی اس لیے کہ میڈیا نے یہ زبردست پروپیگنڈہ کررکھا تھا کہ مسلمانوں کی آزادی پورے یورپ کے لیے خطرہ ہے۔ اسی خطرہ کو بنیاد بنا کر بوسنیا، ہرزے گوئنا اور سراجیو میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

یہودیوں کے دست تصرف میں جو میڈیائی ادارے اور مراکز تھے وہ تو اور زیادہ اسلام دشمن تھے یہ یہودی اور صہیونی ادارے عالمی میڈیا پر کنٹرول رکھتے ہیں میڈیا کے تعلق سے یہودیوں کا موقف معلوم ومشہور ہے، ۱۸۶۹ء میں یہودی حاخام ''راشورون'' نے پراگ میں میڈیا پر کنٹرول حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا:

''دنیا پر کنٹرول کے لیے اگر سونے کے ذخائر پر قبضہ ہمارا پہلا ترجیحی ذریعہ ہے تو میڈیا دوسرا ذریعہ ہے۔

۱۸۹۷ء میں تھیوڈر ہرٹزل نے سوئزرلینڈ کے شہر ''بال'' میں کہا کہ: ''اسرائیل کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان کا میڈیا خاص طور پر صحافت پر مکمل قبضہ نہ ہوجائے''۔

حکماء صہیون کے پروٹوکول نمبر ۱۲ میں درج ہے:

پریس کو ہم اس طرح کنٹرول کریں گے:

''صحافت کو ہم اپنے قابو میں کریں گے اس طرح کہ وہ ہماری مرضی کے مطابق چلے''۔

''ہمارے دشمن کو اس میں دخل نہ ہوتا کہ وہ اپنی بات نہ کہہ سکے''۔

''کوئی بھی خبر ہمارے وسائل وذرائع ابلاغ سے بچ کر عوام تک نہ پہونچے''۔

''ہمارے اپنے اخبارات ہوں، وہ جس کی تائید کریں وہ ظاہر ہو، جس کی مذمت کریں وہ ذلیل ہو، جس نظام کو ہم پسند کریں عوام بھی اس کو پسند کریں، اور جس کو ناپسند کریں عوام بھی اس کو ناپسند کریں، ہم جب چاہیں فتنہ وفساد پیدا

کردیں، جس فتنہ کو دبانا چاہیں اس کو دبا سکیں''۔

''اس کام کے لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگ صحافت میں داخل کیے جائیں جن کا کوئی کیرکٹر نہ ہو، وہ ہمارے تابع ہوں، اور جب وہ اپنی رائے ظاہر کرنا چاہیں جو ہمارے مفاد کے خلاف ہو تو ہم ان کو بدنام کرکے عاجز کردیں''۔

مغربی میڈیا کے اس موقف کی وجہ سے دنیا میں کہیں بھی کوئی بم دھماکہ ہو، یا دہشت گردی کے واقعات اور کارروائیاں ہوں مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے، تاکہ پوری دنیا مسلمانوں کی مذمت کرنے لگے اور اسلام کے بارے میں غلط تصور قائم کرلے، دنیا کے کسی بھی حصہ میں کسی بھی وقت کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو عالمی میڈیا بغیر کسی تحقیق کے مسلمانوں کو ہی مجرم گردانتا ہے، چنانچہ حادثہ کے فوراً بعد مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کا پہاڑ توڑا جانے لگتا ہے، ''اوکلاھوما'' کے واقعات اس کی زندہ مثالیں ہیں جن کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا اس میں دور تک کوئی ہاتھ نہیں تھا، او راصل میں اس کا مجرم ایک یورپین عیسائی تھا۔ امریکہ کے ۹/۱۱ کے بارے میں اسی طرح کی رپورٹیں اور خود امریکی دانشوروں کی تحقیقات ہیں، لیکن مغربی میڈیا سرکاری بیان ہی کو مسلسل نقل کرتا رہتا ہے، عالمی میڈیا کا یہ اب مزاج بن گیا ہے کہ ہر تشدد کے واقعہ کو اسلام اور مسلمانوں سے جوڑے اور اس کے نتیجہ میں بے قصور مسلمان ملزم قرار دئے جاتے ہیں اور طویل مدت تک عذاب میں مبتلا رہتے ہیں، بعض خوش قسمت عدالت میں بری قرار دیے جاتے ہیں، مگر اس وقت تک کی ان کی زندگی اور ان کا خاندان تباہی کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔

اس سیاسی پروپیگنڈہ کے ساتھ ساتھ معاصر یورپین میڈیا سماج میں تہذیب جدید کے عنوان سے فواحش ومنکرات، اور حیا واخلاق سوز باتوں کو رواج دیتا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ اسلام عورتوں کے ساتھ ظلم کرتا ہے اور انسانوں کے بنیادی حقوق اور آزادی سلب کرنا چاہتا ہے۔

موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ نے جو طاقت حاصل کرلی ہے وہ جغرافیائی حدود سے بالا تر ہے۔ آج ملکوں اور قوموں کی تقدیریں نوک قلم سے وابستہ ہوگئی ہیں اور صحافت ملتوں اور قوموں کا مزاج بناتی اور بگاڑتی ہے۔

اس وقت جو بھی عالم اسلام کے حالات کا جائزہ لے گا وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اسلامی بیداری پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے، اس کا اندازہ مسلم تنظیموں کی سرگرمیوں سے لگایا جاسکتا ہے، اگرچہ وہ غیر منظم ہیں، یہ بیداری محض خواب یا خام خیالی نہیں ہے؛ بلکہ اس وقت یہ بیداری تجربہ اور امتحان کے مرحلہ سے گزر رہی ہے، اسی وجہ سے دشمنانِ اسلام اور ان کے ہمنوا پریشان ہیں اور اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اسلامی بیداری کے سارے راستے بند اور سوتے خشک کردیے جائیں، لیکن ان کی یہ کوشش کہ اس بیداری کو روک دیں اور اسلامی ضمیر وشعور کو مردہ کردیں، اسی طرح ناکام ہوگی جیسے ماضی میں ان کی کوششیں ناکام ہوچکی ہیں جبکہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائی، ان کی تاریخ کو مسخ کیا، ان میں جہالت عام کی، مسلم بچوں کی صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کے نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ان کو خود کفیل ہونے سے روک دیا۔

یہ کوششیں جو علم وفن اور بحث وتحقیق کے نام پر شروع کی گئی تھیں اور حکومت کی حمایت بھی حاصل تھی، اسلامی بیداری کو روکنے میں ناکام رہیں اور ان کی تمام داخلی اور خارجی سازشیں ایک ادھورا خواب بن کر رہ گئیں اور اسلام غالب رہا اور اب یورپ میں بھی اسلام کو مقبولیت حاصل ہورہی ہے، اس کی نمایاں دلیل وہاں جگہ جگہ مساجد اور اسلامی مراکز کا قیام ہے، اسلامی بیداری کو روکنے کی کوشش خود اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام ایک طاقتور اور زندہ مذہب ہے، تو دوسری طرف اسلامی ممالک میں اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش بھی ہورہی ہے۔

یہی وہ ممالک ہیں جو نظام تعلیم وتربیت، تہذیب وتمدن اور ذرائع ابلاغ کے استعمال میں یورپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور میڈیا کو کھلے عام زہر پھیلانے کی چھوٹ دے رکھی ہے، مغرب کی غلامی کی دعوت دے رہے ہیں، مغربی تہذیب کو سراہ رہے ہیں اور اس کے انسانی جرائم کو چھپا رہے ہیں، اسلامی روح کو ختم کررہے ہیں، صرف اتنا ہی نہیں کہ اسلامی بیداری سے توجہ ہٹا رہے ہیں؛ بلکہ اسلامی تحریک کو کچل رہے ہیں، امت کی ناگواری ونارضگی کے باوجود مخالف طاقتوں کو گلے لگا رہے ہیں اور اسلام پسندوں کی نقل وحرکت پر قدغن لگائی جارہی ہے، افسوس کی بات تو یہ ہے کہ دشمنوں کو مسلمانوں ہی میں سے ایسے افراد مل رہے ہیں جو ان کے مقاصد کو پورا کررہے ہیں۔

اسلام کے خلاف مخصوص اہل فکر وفن کی آوازوں پر ملت کوئی توجہ نہیں دیتی اور بدلتے ہوئے حالات اور اسلامی جذبہ سے بھرا ہوا ماحول ان کے موافق بھی نہیں، اگر ان کو اسلامی ممالک کے نام نہاد مسلم حکام کی پشت پناہی حاصل نہ ہوتی اور اسلام پسندوں کے خلاف جارحانہ کارروائیاں نہ ہوتیں تو بیمار ذہنیت کے حامل روشن خیال اور بکے ہوئے قلم یہ جرأت نہ کرپاتے کہ مسلم اکثریت کے دین، تہذیب اور تاریخ کے

خلاف ایک لفظ بھی نکالیں اور اگر یورپ کے تابع نظام ہائے حکومت کی حمایت وتائید نہ ہوتی تو مسلم قوم کی ناراضگی، اس کی دینی غیرت وحمیت ان طفیلی عقلوں کو سبق سکھادیتی۔

عالم اسلام میں طفیلی عقل کا عہد ختم ہوگیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب کے غلبہ کے بعد قائم ہونے والے نظام حکومت سامراج کا آلہ کار تھے، اور سیاسی واقتصادی نظام اور سماجی فلسفوں نے عالم اسلام کو اختلاف وانتشار اور غلامی کے علاوہ کچھ نہیں دیا اور آج عالم اسلام میں جو انتشار وافتراق اور ٹکراؤ نظر آرہا ہے، وہ مغرب کے سیاسی اور فکری سامراج کا نتیجہ ہے۔

خطرہ کی بات یہ ہے کہ نام نہاد اسلامی مفکرین جو مغربی ذہنیت کے مالک ہیں اسلام مخالف افکار کا نمونہ پیش کر رہے ہیں، نوخیز قلمکاروں سے ایسی کتابیں لکھوائی جارہی ہیں جو کتاب وسنت سے ہٹ کر اسلام کی تشریح وتوضیح پیش کرتی ہیں اور اس کا مقصد اسلام کو اندر سے کمزور کرنا ہے، جس کی بنا پر ایسے ایسے واقعات پیش آرہے ہیں جو فتنہ وفساد کا باعث ہورہے ہیں اور اسلامی معاشرہ میں استحکام اور اتحاد واتفاق کی فضا ہموار کرنے کی راہ میں روڑہ بن رہے ہیں۔

عالم اسلام قدرتی ذخائر ومعدنیات سے مالا مال ہے، اہم عالمی گزرگاہیں اسی میں ہیں، اس کو جغرافیائی اور اسٹراٹیجک پوزیشن حاصل ہے، زبردست افرادی طاقت کا مالک ہے اور اس کے فرزند عظیم صلاحیتوں کے مالک ہیں، اس سب کی بنیاد پر وہ صرف روس وامریکہ ہی پر نہیں؛ بلکہ پوری دنیا پر اسرائیل سے زیادہ اثرانداز ہوسکتا اور اپنی بات منواسکتا ہے، لیکن آپسی اختلاف اور حکومت اور قوم کے درمیان حائل خلیج نے اس پر پانی پھیر دیا ہے، اب وقت آگیا ہے کہ حکام اور قوم کے درمیان دوریاں ختم ہوں، آپسی اختلاف دور کریں اور ایک دوسرے کے معاون ہوجائیں، اور عوام کی طرح قائدین میں بھی بیداری پیدا ہو اور ان کو اپنے حقیقی دوست ودشمن کی پہچان ہوجائے، اگر مسلم قوم ایسا کرے تو دشمنوں کے سارے سہارے ختم ہوجائیں اور ان بڑی طاقتوں کے اصل چہرہ سے پردہ اٹھ جائے جن پر اسلامی ممالک بھروسہ کرتے ہیں اور اسلام مخالف نظام اور نظریات ختم ہوجائیں، ساری سازشیں اور ہتھکنڈے ناکام ہوجائیں، سارے فلسفے کسی کام کے نہ رہ جائیں اور پھر عوام اور اسلامی اور عربی حکومتوں کے سامنے کوئی چارہ نہ رہ جائے سوائے اس کے کہ وہ اپنی حقیقت اور اصلیت کی طرف واپس آجائیں اور اگر ایسا نہیں کیا تو ان کا انجام بھی ماضی کی بھولی بسری قوموں کی طرح ہوگا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اسلامی ممالک فیصلہ کریں کہ وہ آزادی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں، یا ماضی قریب کے ممالک محروسہ کی طرح رہنا چاہتے ہیں جس کا سلسلہ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد شروع ہوا تھا؟

صلیبی غلبہ اور مسلمانوں پر یورپی ملکوں کی بالادستی کا سبب ان میں دینی روح کی بیداری تھی اور یہ احساس تھا کہ اگر وہ نہیں جاگے تو مسلمان ان کو ختم کردیں گے، دوسری طرف پوپ اور پادریوں نے عیسائیوں میں انتقام کی روح پھونک دی اور پورے یورپ کو مسلمانوں کے خلاف متحد کردیا اور مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہر میدان میں کوشش کی، چنانچہ پورا یورپ مذہب کے نام پر متحد ہوگیا۔

مسلمان وہ امت ہیں جس میں سب سے زیادہ اتحاد واتفاق اور یکجہتی اور یگانگت ہونی چاہیے، اس لیے کہ ان کی عبادت بھی اتحاد کا مظہر ہے جس کا نمونہ مساجد پیش کرتی ہیں اور حج تو اس کا بہترین نمونہ ہے کہ مسلمان اس عبادت کی ادائیگی میں ایک لباس میں ملبوس ہوتے ہیں، ان کا شعار ایک ہوتا ہے، ایک ہی احساس کے ساتھ ایک خدا کی کبریائی بیان کرتے ہیں، اور خدائے واحد لاشریک لہ کو بیک آواز پکارتے ہیں، پھر ان کے درمیان یہ اختلاف کیوں؟!!

مسلمانوں کا طرز زندگی اور ان کے معاملات زندگی وحدت سے عبارت ہیں، مسلمانوں کو ہر معاملہ میں باہمی مشورہ کی تلقین کی گئی ہے، عفو ودرگزر، حلم وبردباری، صبر وضبط، تحمل وبرداشت، ایثار وقربانی مسلمانوں کے اوصاف بتائے گئے ہیں، چنانچہ مسلمان زیادہ حقدار تھے کہ وہ وحدت کو اپنا شعار بناتے، زندگی کے تمام شعبوں میں وحدت جلوہ افروز ہوتی، لیکن آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سب سے زیادہ آپسی اختلاف وانتشار، عناد ودشمنی، بغض وحسد، جنگ وجدال اور انتقام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ یہ کھلا تضاد ہے جو اسلام کی روح کے منافی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم قائدین اپنے اندر خود اعتمادی وخودی پیدا کریں، غلامی کے طوق سے نکل کر آزادی کی فضا میں سانس لیں، نئے سامراج کے چنگل سے نکل کر اسلامی تشخص اور اسلامی شناخت کو مضبوطی سے تھام لیں، دشمن سے دوری اختیار کریں اور سب سے بڑھ کر ایمان ویقین کی قوت سے لیس ہوں اور ہمہ وقت ان کے دل ودماغ میں یہ تازہ رہے کہ وہ بہترین امت ہیں جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے اور مستقبل مسلمانوں کا ہے۔

☆☆☆☆☆

حق و باطل

# مغربی نظامِ تعلیم مسلمانوں کے لیے چیلنج

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

مسیحی یورپ نے صلیبی جنگوں میں شکست کھانے کے باوجود مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا تھا، اس کو ان کی ترقی کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے، چونکہ انہوں نے ایک طویل اور گہری منصوبہ بندی (Planning) کے بعد مسلمانوں سے اقتدار حاصل کیا تھا اس لیے شروع ہی سے مسلمانوں کو انہوں نے اپنا اصل حریف سمجھا، ان کو اس کا اندازہ تھا کہ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو دنیا کی قیادت کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، اور اس کے پاس ہر طرح کے مسائل کا حل موجود ہے، اگر اس کو موقع دیا گیا تو دنیا کا اقتدار دوبارہ انہی ہاتھوں میں چلا جائے گا، اس لیے یورپ نے مسلمانوں کی طاقت کمزور کرنے اور اسلام سے ان کے رشتہ کو منقطع کرنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

فرانسیسی اور برطانوی سامراج نے جس طرح اسلامی دنیا کو اپنے شکنجہ میں جکڑا اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے تاریخ اس کی گواہ ہے، لیکن جب ان کو اس تجربہ سے یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کو اس طرح نہیں کچلا جاسکتا تو انہوں نے اس کے دوسرے ذرائع اختیار کیے۔ بنیادی طور پر تعلیم اور تحقیق اور رسرچ کو انہوں نے اس کا ذریعہ بنایا، ایک طرف مستشرقین (Orientalist) کی جماعت تیار کردی جس کا کام یہ تھا کہ آہستہ آہستہ اسلام پر مسلمانوں کے اعتماد کو ختم کیا جائے، اور خاص طور پر ذہین طبقہ میں ایسے شکوک وشبہات پیدا کیے جائیں کہ وہ دین سے برگشتہ ہوتے چلے جائیں، اس میں ان کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ سامراجی نظام تو ختم ہوگیا لیکن مسلمان ملکوں میں وہ نظامِ تعلیم رائج کیا جاچکا تھا جس سے استفادہ کے بعد ایک ذہنی کشمکش کا پیدا ہوجانا یقینی تھا، دوسرے مرحلہ پر انہوں نے ''تغریب'' کا کام کیا، اور ایسے ذہین، تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو کیچ (Catch) کیا جن کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوچکے تھے، ان کو مغربی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے عنوان سے لے جایا گیا اور وہاں ان کی ایسی ذہن سازی (Brain Washing) کی گئی کہ وہ اپنے اپنے ملکوں میں خالص مغربی ذہن کے ساتھ لوٹے، مسئلہ صرف دین پر اعتماد ختم ہوجانے پر منحصر نہیں تھا، بلکہ وہ دین کے باغی بن کر لوٹے، اس طرح نام نہاد مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جس نے کھل کر دین کا تمسخر کیا، یورپ نے ان کی پوری پشت پناہی کی اور ''آزادیٔ رائے'' کی دوغلی پالیسی کے نام پر ان کو آزادی کے ساتھ زبان وقلم کے استعمال کی اجازت دی گئی۔

موجودہ اسلامی بیداری کے لیے مغرب کا یہ نظام تعلیم ایک چیلنج ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جو مغربی نظام تعلیم کا پروردہ ہے مسلمان ملکوں میں اقتدار اس طبقہ کے ہاتھ میں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان تمام ملکوں میں اسلامیت اور مغربیت کی ایک کشمکش جاری ہے، اور مسلمانوں کی ساری توانائیاں اسی کی نذر ہورہی ہیں۔ یہ اسلامی دعوت وفکر کے لیے ایک چیلنج ہے، اور اس کی شدید ضرورت ہے کہ تمام مسلمان ملکوں میں وہ نظام تعلیم رائج کیا جائے جو ان کے قد وقامت پر راست آئے۔

☆☆☆☆☆

سراغِ زندگی

# قلب وروح کی اصلاح

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

شریعت نے انسان کے لیے زندگی کا جو نظام مقرر کیا ہے، وہ اس کے پورے وجود کا احاطہ کرتا ہے، سر سے لے کر پاؤں تک جسم کا کوئی عضو نہیں، جس کے لیے شریعت کی کوئی ہدایت موجود نہیں ہو؛ کیوں کہ انسان کو خدا سے بندگی کی نسبت حاصل ہے، اللہ معبود ہیں اور انسان عبد، اللہ خالق ہیں اور انسان مخلوق ہے، اللہ مالک ہیں اور ہم سب اس کے مملوک، آقا کا حق ہے کہ غلام کی ہر حس وحرکت اس کے منشا کے مطابق ہو اور مالک کو حق ہے کہ اپنی ملکیت میں ایک ایک ذرہ پر اس کا تصرف جاری رہے؛ اس لیے انسان کی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا پورا وجود احکام الٰہی کے تابع ہو اور اسی لیے شریعت کے احکام انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔

جیسے شریعت نے انسان کے ظاہر کے لیے احکام دیے ہیں، اسی طرح اس کے باطن کے لیے بھی بہت سے احکام دیے ہیں، مثلاً جب کوئی شخص نماز پڑھے تو وہ کھڑا ہو، رُکوع کرے، سجدہ کرے، قیام میں قرآن مجید کی تلاوت اور رُکوع و سجدہ میں تسبیحات کا اہتمام کرے، رمضان المبارک میں صبح کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کھانے پینے سے رُکا رہے، یہ اور اس طرح کے ہزاروں احکام ہیں، جن کا تعلق ظاہری افعال سے ہے، اس کے ساتھ ساتھ بہت سے باطنی افعال بھی ہیں، جن کا حکم دیا گیا ہے، نماز کے وقت انسان کے اندر خشوع کی کیفیت ہو: "اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ" [مومنون:۲] نماز پڑھنے کی وجہ سے یہ کیفیت حاصل ہو کہ اللہ کی یاد اس کے دل میں بس جائے: "وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ" [طٰہٰ:۱۴] انسان کے اخلاق بہتر ہوں، اس میں نرم خوئی ہو، مخلوق کے ساتھ ایثار وشفقت ہو، تواضع اور کسر نفسی ہو، ریا اور دکھاوے کا جذبہ نہ ہو، خدا کا خوف بھی ہو اور خدا کی محبت بھی، گناہ پر شرمندگی اور ندامت کا احساس ہو، اللہ کی توفیق سے کوئی نیک کام کرے تو خوشی کا احساس ہو اور کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو رنج وملال ہو، یہ اور اس طرح کے بہت سے افعال ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے۔

ظاہری افعال کا صدور جسم کے مختلف ظاہری اعضاء — زبان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ — سے ہوتا ہے اور باطنی افعال کا سرچشمہ انسان کا دل ہے؛ اسی لیے قرآن مجید میں اس انسان کو کامیاب و بامراد بتایا گیا ہے، جو اللہ کے دربار میں اللہ کی طرف جھکنے اور اللہ کی مرضیات کو بجالانے والا دل لے کر آئے؛ کیوں کہ جس دل میں انابت ہوگی، اسی میں اللہ کی خشیت بھی ہوگی: "مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ" [ق:۳۳] قیامت کے دن ایسا ہی پاکیزہ دل انسان کے کام آئے گا: "یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ، اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ" [شعراء:۸۸-۸۹] جو لوگ ہدایت سے محروم ہیں، ان کا سب سے بڑا مرض یہ ہے کہ ان کے دلوں میں قبولیت کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے: "لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا" [اعراف:۱۷۹] یہاں تک کہ بعض دفعہ تو انسان اپنی اس بے توفیقی پر اترانے لگتا ہے اور اس کے دل کے دروازے اس طرح بند ہوجاتے ہیں کہ وہ جذبہ خیر سے بالکلیہ محروم ہوجاتا ہے: "وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ" [بقرہ:۸۸] قلب انسانی کی اسی اہمیت اور اعمال واخلاق میں اس کے غیر معمولی کردار کی وجہ سے قرآن مجید میں بار بار اس بات کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے احوال سے واقف ہیں: "وَهُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" [حدید:۶]

انسان کے لیے ایک بہت بڑی ضرورت دل کے اصلاح کی ہے؛ کیوں کہ تمام اچھے اور برے اعمال کا اصل سرچشمہ انسان کا دل ہے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب اس کا رُخ درست ہوجاتا ہے تو انسان کی ساری زندگی درست ہوجاتی ہے اور اگر وہ درست نہ رہا تو انسان کا پورا وجود بگاڑ میں مبتلا ہوجاتا ہے'': إن فی الجسد مضغة إذا صلحت صلح كله و إذا فسدت فسد كله ألا وهی القلب۔ [السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر:۱۰۱۸۰]

اس وقت دنیا میں شاید سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ انسان کے دل بدلے جائیں، صنعت و ٹکنالوجی نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ زمین کی گہرائیوں سے لے کر فضاء کی اتھاہ بلندیوں تک ہر جگہ انسان رسائی حاصل کرچکا ہے اور مسلسل اس کی

ترقی کا سفر جاری ہے، راحت وآسائش کے ایسے ایسے سامان اس نے کرلیے ہیں کہ گویا وہ جنت کا مقابلہ کرنے کے لیے کوشاں ہے؛ لیکن دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ اس کی یہ علمی ترقی انتہائی غلط مقاصد کی طرف بڑھتی جارہی ہے، اس نے انسان کی زندگی بچانے کے لیے جتنی دوائیں ایجاد کی ہیں، اس سے زیادہ انسان کو ہلاک کرنے والے ہتھیار بنالیے ہیں، میڈیکل سائنس ترقی کے اوجِ کمال پر پہنچ چکی ہے، اس نے علاج کے نت نئے طریقے دریافت کرلیے ہیں؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علاج کو تجارت بنالیا گیا ہے، تعلیمی اداروں کی بہتات ہے اور شرح تعلیم میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تعلیم جیسے مقدس پیشہ کو خالصتاً کسبِ زر کا ذریعہ بنالیا گیا ہے اور تعلیم نے زبردست کاروبار کی حیثیت اختیار کرلی ہے، پھر ان اداروں سے سندِ فراغت حاصل کرکے جو لوگ میدانِ عمل میں اُترتے ہیں، دن و رات وہ سنگین قسم کے الزامات میں ماخوذ ہوتے رہتے ہیں۔

حد تو یہ ہے کہ جو لوگ دین کے مختلف شعبوں سے جڑے ہوئے ہیں، مال کی طمع اور عہدہ وجاہ کی حرص نے انھیں بھی اپنی زلفوں کا اسیر بنا رکھا ہے، بڑی بڑی دینی جامعات میں اس بات کی لڑائی ہے کہ ناظم اور صدر مدرس کون بنے گا؟ تنظیموں میں صدر اور جنرل سکریٹری بننے کے لیے جنگ و جدال کا ایسا بازار گرم ہے کہ عام مسلمان اس کا حال سن کر انگشت بدنداں ہیں، دینی جماعتوں میں جھگڑا ہے کہ امیر کون ہوگا اور شوریٰ میں کس کی حصہ داری ہوگی؟ بخاری شریف کا آغاز ایک ایسی حدیث سے ہوتا ہے، جس میں اخلاص نیت کی تعلیم دی گئی ہے؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے پوری پوری عمر قرآن وحدیث کی تدریس میں گذاری ہے، وہ اس بات پر لڑتے ہیں کہ بخاری شریف کا درس تجھ سے متعلق ہو یا مجھ سے؟ کیوں کہ مدارس کے اندر بخاری شریف کے درس سے لوگوں نے عزت ووقار کو متعلق کرلیا ہے، انتہاء یہ ہے کہ دینی جامعات اور دینی تنظیموں کے مقدمات سرکاری عدالتوں میں چل رہے ہیں، جو لوگ عام مسلمانوں کو سرکاری عدالتوں میں جانے سے روکتے ہیں، وہ خود عدالتوں کی چوکھٹ پر کھڑے ہیں، خانقاہیں تزکیۂ قلوب کا مرجع تھیں؛ لیکن یہاں تولیت کے جھگڑے ہیں اور اوقاف پر قبضہ وتصرف کی لڑائی ہے۔

آخر یہ سب کچھ کیوں؟ کیا اس کا سبب علم کی کمی ہے؟ کیا اس کا باعث معاشی پسماندگی ہے؟ کیا اس کی وجہ تعلیم کا پچھڑا پن ہے؟ نہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے در ودیوار کو سجانے کی کوشش کی، جسم وتن کو آراستہ کیا، علوم وفنون کے چراغ روشن کیے، ایجادات واختراعات پر اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں، عیش وعشرت کے نقشے سجائے؛ لیکن دل کی دنیا کو سجانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یہ دنیا اندھیری کی اندھیری رہ گئی، اور اس دنیا کی تاریکیاں بڑھتی چلی گئیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مثال اس ظاہر بیں کاشت کار اور باغبان کی ہوگئی ہے، جو پودوں کے تنوں اور درختوں کی ٹہنیوں پر تو پانی کا ایک دریا بہادے؛ لیکن جڑوں کو پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پہنچائے؛ حالاں کہ جب تک جڑوں میں تراوٹ وتازگی نہ پیدا ہوگی، اس وقت تک تنوں اور شاخوں کو پانی دینا کچھ کام نہ آئے گا۔

اسی لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی اصلاح کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا؛ کہ جب دل کی دنیا روشن ہوگی تو دین کے تمام شعبوں میں روشنی آئے گی، اسی کو قرآن مجید میں تزکیہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ ذمہ داری قرار دیا گیا ہے کہ وہ انسان کے باطن کو گناہ کی آلائشوں سے پاک کریں: ”يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ“ [آل عمران:۱۶۴] اور اسی کو حدیث میں ”احسان“ فرمایا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، یا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے ہو تو اس بات کا استحضار ہو کہ اللہ ہمیں دیکھ رہے ہیں: أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك [بخاری، حدیث نمبر:۴۸] عبادت، نماز وروزہ ہی تک محدود نہیں ہے، یہ تو عبادت کے اعلیٰ ترین مظاہر ہیں؛ لیکن اصل یہ ہے کہ عبد کے ہر عمل میں عبادت کا رنگ ہو اور بندہ کا ہر لمحۂ زندگی بندگی کے نور سے روشن ہو، خاندانی زندگی ہو، لوگوں کے ساتھ معاملات ہوں، یا انسان کے اخلاق، ہر جگہ اور ہر موقع پر خدا کا استحضار ہو، جیسے انسان کتنی بھی تیز سواری چلا رہا ہو، اگر سواری کو کنٹرول کرنے والا کیمرہ آجائے تو آدمی اپنی رفتار پر فوراً کنٹرول کرتا ہے؛ حالاں کہ سامنے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی، ٹوکنے والی کوئی زبان نہیں ہوتی اور بظاہر ایکسیڈنٹ کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا؛ لیکن اس کے باوجود گاڑی چلانے والا احتیاط کا دامن تھام لیتا ہے، اس کے بڑھتے قدم تھم جاتے ہیں، دل کی اصلاح سے انسان کے رویہ میں یہی مثبت تبدیلی آتی ہے۔

دل میں صالح تبدیلی ہی کا نام تقوی ہے؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "التقوی ھھنا واشار إلی الصدر" رمضان المبارک تقویٰ کا مہینہ ہے اور روزے اسی لیے فرض کیے گئے ہیں کہ انسان کے اندر تقوی پیدا ہو: "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" [بقرہ:۱۸۳] تقویٰ کی تربیت کے اس مہینے میں ہر مسلمان کو اپنا جائزہ لینا چاہیے اور دل کی دنیا روشن کرنے کی فکر ہونی چاہیے، ہر عہد میں اللہ کے جو نیک بندے گذرے ہیں، معروف کرخی اور بشر حافی، شقیق بلخی اور بایزید بسطامی، جنید بغدادی اور ابوبکر شبلی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ محمد رفاعی، شیخ ابوالحسن شاذلی اور خواجہ عثمان ہارونی، خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ بہاؤالدین نقشبندی، خواجہ باقی باللہ اور شیخ احمد سرہندی رحمہم اللہ، اور پھر ان کے بعد آنے والے علماء ومشائخ، یہ سب دل کی دوا بیچنے والے، باطن کے معالج اور روحانیت کے سوداگر تھے، جن کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہوئی اور بیشمار افراد ہدایت سے سرفراز ہوئے، آج بھی انسان کو حقیقی انسان اور مسلمان کو سچا مسلمان بنانے کے لیے اسی علاج کی ضرورت ہے، اور اسی کی کمی ہے کہ ظاہری کمالات میں ترقی کے باوجود متاع انسانیت گم ہوتی جارہی ہے، انسان اگر اپنے من میں ڈوب جائے، اپنی حقیقت کو اچھی طرح سمجھے اور قلب ورُوح کی تروتازگی کا سامان کرے تو اس کے لیے سراغِ زندگی کو پانا چنداں دشوار نہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

☆☆☆☆☆

# عقیدۂ توحید کی فکر کیجیے!

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

اس وقت ہندوستان میں جو ہمارا ملک ہے، اس میں ہمارے لوگوں کو عقیدہ کی فکر نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن نے: "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" کے ذریعہ سب کو خبردار کردیا ہے، حضرت یعقوبؑ نے اپنے افرادِ خاندان کو آخری وقت میں جمع کیا اور عقیدہ کی طرف سے اطمینان چاہتے ہوئے پوچھا تھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ اسمیں یہی ہے کہ نبوت کے گھرانے کو اپنے عقیدہ کی فکر ہے تو وہ آپ کو اور ہم کو نہیں ہونی چاہیے؟ جبکہ ہمارا حال ایسا ہے کہ عقیدہ کب اور کس وقت کدھر مڑ جائے اور کس چیز سے منتشر ہوجائے، اسی وجہ سے آج ہماری حالت دگرگوں ہے اور عقیدہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے، عقیدہ اس کا نام نہیں ہے کہ صرف زبان سے "لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" کہہ دیا، بیشک یہ عقیدہ ہے؛ لیکن عقیدہ کا تعلق دماغ سے دل سے ہے، تنہا زبان سے نہیں ہے، عقیدہ غیر معمولی چیز ہے کہ عقیدہ جب دل ودماغ میں آتا ہے تو انقلاب برپا کردیتا ہے، اس کا دماغ اور سوچ بدل جاتی ہے، دل اور جذبات بدل جاتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں اس کے اعمال بدل جاتے ہیں، اس کی قوت غیر معمولی ہوجاتی ہے، حوصلہ بلند ہوجاتا ہے کہ بڑی بڑی طاقتیں اس کے سامنے دم نہیں مار سکتیں، اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہوجائے، اس لیے حدیث میں آتا ہے: ''ایک مسلمان کا قتل اللہ کے نزدیک ساری دنیا کی تباہی سے بڑھ کر ہے'' یعنی جو صاحب توحید ہوتا ہے، اور جام توحید چڑھائے ہوئے ہوتا ہے، وہ اللہ کے نزدیک اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ ساری دنیا ایک طرف، اسکا وجود ایک طرف، حضرت مولاناؒ نے ''تاریخ دعوت عزیمت'' میں لکھا ہے، پڑھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے، یہ سب نتیجہ اسی توحید کا ہے جو ان حضرات کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی طور پر عطا فرمایا تھا۔

ضرورت ہمیں اس بات کی ہے کہ ہم بھاری بھرکم ہوجائیں، باوزن ہوجائیں، اپنی قیمت کو پہچانیں، حدیث میں پڑھا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میں دو بھاری چیزوں (ثقلین) کو چھوڑ کر جارہا ہوں، اگر تم نے ان بھاری بھرکم چیزوں سے اپنا تعلق قائم رکھا تو تم بھی بھاری بھرکم ہوجاؤ گے: ایک تو اللہ کی کتاب ہے جو خود بھاری بھرکم ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر جو غیر معمولی طاقت رکھی ہے، اس کا اندازہ ہم کو اور آپ کو بھی نہیں ہوگا کہ اللہ کی کتاب کیا ہے؟

صرف اللہ کی کتاب کی زبان کو ہی لے لیجیے جو عربی زبان میں ہے اور یہ عربی زبان تمام زبانوں میں سب سے زیادہ باوزن ہے، ساری زبانیں بے وزن، عربی زبان باوزن، ساری زبانیں مٹ جانے والی، عربی زبان باقی رہنے والی، ساری زبانیں جو پہلے تھیں وہ مٹ چکیں، جواب ہیں وہ مٹ جائیں گی، پہلے جن جن زبانوں میں کتابیں نازل ہوئیں، کتابیں بھی نہیں رہیں، زبانیں بھی نہیں رہیں اور یہ بھی شان ہے اللہ کی "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ" اللہ تعالیٰ ہی زبانوں کو پیدا کرتا ہے اور وہ علوم کو برپا کرتا ہے، نہ وہ زبانیں رہیں نہ وہ علوم رہے جو ان زبانوں سے وابستہ تھے، یہ عربی زبان باقی رہے گی اور اس سے وابستہ علوم بھی باقی رہیں گے۔

☆☆☆

اخلاقِ نبوی

# ہمارا سب سے مؤثر ہتھیار

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

بات اگر اپنی ہو تو دل لگتا ہے، تو کیوں نہ آج اپنی ہی بات کی جائے؟ کیوں نہ اپنے حالات کا جائزہ لیا جائے؟ کیوں نہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی جائے؟ مجلس اپنی ہے، غیر کا یہاں گذر نہیں، چھپانے کی یہاں کچھ ضرورت نہیں، بڑی طاقتوں، ان کے منصوبوں اور سازشوں اور ان کی اسلام دشمن پالیسیوں کے تذکرہ سے تو اخبارات و رسائل بھرے رہتے ہیں، ان مسائل کو گفتگو کا موضوع بنانے سے کیا حاصل جو حکومت اور ذمہ داران حکومت سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم سوائے غصہ کرنے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے، ہم کو اپنی فکر کرنی چاہیے، اپنا جائزہ لینا چاہیے اور پھر اس جائزہ کی روشنی میں تبدیلی لانے کی کوشش کرنی چاہیے، جو مسائل ہم حل کر سکتے ہیں پہلے ہم کو ان مسائل پر گفتگو کرنی چاہیے جس دائرہ میں رہ کر ہم کام کر سکتے ہیں اسی دائرہ میں رہ کر ہم کو کام کرنا چاہیے، اگر ہم اس طرح زندگی گذارنے میں کامیاب ہو گئے تو دشمن کے یہ سارے منصوبے، ان کی یہ ساری پالیسیاں، ان کو حاصل یہ سارے وسائل، ذرائع ابلاغ پر ان کا یہ کنٹرول اور ان کی یہ فوجی برتری ان کے کچھ کام نہ آئے گی، ماضی کے واقعات اس پر شاہد ہیں اور تاریخ کی کتابوں میں وہ سب محفوظ ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم جگہ جگہ ناکام ہیں اور ہمیں اپنی ناکامی کا احساس بھی ہے اور ناکامی کے اسباب کی تلاش بھی، ناکامی کی ایک بڑی وجہ اگر یہ قرار دی جائے کہ ہم ریت کے ذرات کی طرح بکھرے ہوئے اور خود رو پودوں کی طرح ادھر ادھر اُگے ہوئے ہیں تو شاید یہ غلط نہ ہوگا، ہمیں صرف اپنی ذات سے دلچسپی ہے، صرف اپنی عزت و شہرت اور دولت و منصب کی فکر ہے، اپنی ذات کے خول سے جب ہم باہر نکلتے ہیں تو اولاد تک پہنچ کر ہمارے قدم رک جاتے ہیں، خیال اب صرف یہ رہتا ہے کہ ہماری اولاد پڑھ جائے، جلدی سے کام میں لگ جائے اور ایک خوش حال اور آرائش و آسائش سے بھر پور زندگی گذارنے کا اسے موقع مل جائے، اولاد سے اوپر اٹھتے ہیں تو اپنی تنظیم، اپنی پارٹی، اپنی سوسائٹی، اور اپنے ادارے میں محصور ہو کر ہر طرف سے اپنی آنکھیں موند لیتے ہیں، یہی ہماری سوچ کا دائرہ اور یہی ہماری فکر کا محور ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اسی ذہنیت اور اس طرز فکر کو قوموں کے لیے خطرناک ترین قرار دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''اس ذہنیت نے قوموں کے چراغ گل کر دیے، جہاں یہ ذہنیت طاری ہوتی ہے وہاں کوئی سرپٹک کر رہ جائے اور کوئی بڑے سے بڑا مصلح اپنی پوری زندگی صرف کر دے کوئی اثر نہیں ہوتا، ساری خرابی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ذہن اجتماعی نہیں، ملی نہیں، بلکہ ذہن انفرادی اور شخصی ہے، ملت کے مسائل اور دین کے تقاضوں کا درد اگر آپ کے دل میں نہیں اور مل کر کام کرنے کا جذبہ نہیں اور ایک دوسرے کی رعایت کرنے کا مزاج نہیں تو پھر بہت بڑا خطرہ ہے، نہ کوئی انجمن کچھ کر سکتی ہے، نہ کوئی ادارہ، نہ اخبار کچھ کر سکتا ہے اور نہ کوئی رسالہ اور نہ کوئی تقریر کچھ کر سکتی ہے اور نہ کوئی وعظ''۔

قرآن کریم نے فکر و تدبر اور عقل و شعور کے استعمال پر جتنا زور دیا ہے ملت میں اس کا احساس بہت کم پایا جاتا ہے، افسوس کہ بعض دوسری قومیں عقل و شعور سے کام لینے میں ہم سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں، مگر انہوں نے اس ہتھیار کا استعمال صرف مادی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کیا ہے، ان کے برخلاف ہم نے عقل پر جذبات کو ترجیح دی، اور یہی جذباتیت اب ہماری شناخت بن گئی ہے، جوش نے ہمیں دیوانہ اور ہوش سے ہمیں بیگانہ کر دیا، جذبات کی رو میں بہنا ہی اب ہمارا شیوہ بن گیا ہے، نتیجہ اس کا شکست، ناکامی اور رسوائی کی شکل میں ہمارے سامنے آرہا ہے، ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ہانڈی کو تیز آنچ میں پکا کر جلا تو سکتے ہیں لیکن اس کو دھیمی آنچ میں پکا کر کھانے کے لائق نہیں بنا سکتے، ہم ساری توقعات دوسروں سے رکھتے ہیں اور خود ان توقعات پر پورا اترنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔

مسجد کے سامنے غیر مسلم کی بارات گذرتی ہے، ناچ ہوتا ہے، ڈھول بجتا ہے، ہمیں برا لگتا ہے؛ کیوں کہ نماز میں خلل پڑتا ہے، نماز کا احترام اور مسجد کا تقدس ہمیں احتجاج کرنے پر مجبور کرتا ہے؛ لیکن یہی بارات جب کسی مسلمان کی ہوتی ہے اور مسجد کے سامنے خوب دھما چوکڑی مچتی ہے یا نوجوانوں کی ایک ٹولی مسجد کے دروازہ پر ہلڑ ہنگامہ میں مشغول ہوتی ہے تو ہماری غیرت اتنا جوش نہیں مارتی؛ کیوں کہ مسئلہ مسجد کا نہیں اپنی ناک کا ہوتا ہے، جس کو نام مسجد کی حرمت کا دیا جاتا ہے، ورنہ مسجد کی دوکانوں، مکانوں، جائدادوں کا جو حال

خود ہم نے بنا رکھا ہے وہ خود مسجد سے ہماری بے تعلقی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

مسجد وقبرستان کی زمین پر قبضہ جب کوئی غیر مسلم کرتا ہے تو یہ مسئلہ ملی وقومی بن جاتا ہے، لیکن یہی کام جب کوئی شہ زور مسلمان کرتا ہے تو اجتماعیت کی طاقت کا یہ مظاہرہ کرنے سے ملت کا ہر فرد پیچھے ہٹ جاتا ہے، کیونکہ وہ شہ زور کسی کا بھائی ہوتا ہے، کسی کا دوست ہوتا ہے، کسی کی برادری سے ہوتا ہے، اس طرح مسجد اور شہ زور کے درمیان مقابلہ آرائی میں جیت اکثر اسی شہ زور کی ہی ہوتی ہے۔

غیر مسلم حکومت سے ہمارا مطالبہ رہتا ہے کہ وہ ہماری شریعت میں دخل اندازی نہ کرے، عدالت سے ہمارا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری شریعت کے خلاف وہ کوئی حکم صادر نہ کرے، لیکن ہم خود اپنے عمل سے صبح وشام شریعت کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں، عدالتوں میں شریعت کے خلاف اپیل ہم کرتے ہیں، شریعت کے خلاف وکیل ہم کھڑا کرتے ہیں، شریعت کی غلط تشریح جج کے سامنے ہم کرتے ہیں، شریعت کے مطابق دیے گئے عدالت کے فیصلہ کو چیلنج ہم کرتے ہیں، اور پھر بھی سینہ ٹھونک کر حکومت سے یہ کہتے ہیں کہ شریعت کے خلاف کوئی قانون برداشت نہیں کیا جائے گا۔

سیکولر پارٹیوں کے لیڈروں سے تو ہم بڑے درد سے کہتے ہیں کہ کم از کم الیکشن کے موقع پر تو ان کو ایک پلیٹ فارم پر آنا چاہیے تاکہ اس ملک میں سیکولرزم کی شمع کو روشن رکھا جاسکے؛ لیکن ہم خود ہی الیکشن کے موقع پر اپنے ووٹوں کو تقسیم کرکے سیکولرزم کی اس جلتی ہوئی شمع کو بجھانے کا کام کررہے ہیں، قوم پر ہم برادری کو ترجیح دیتے ہیں، اپنے ادارہ کو ترجیح دیتے ہیں، اپنے منصوبوں کو ترجیح دیتے ہیں، پورے پانچ سال تک قوم سے، قومی مسائل سے، اور قومی کاموں سے بیگانہ رہنے والے الیکشن کی تاریخوں کا اعلان ہوتے ہی زمین پھاڑ کر اس طرح نکل آتے ہیں، پھر وہی دکھتے ہیں دوسرا کوئی نہیں، حیرت جتنی ان عیار لوگوں پر ہوتی ہے، اس سے زیادہ حیرت ان سادہ لوح مسلمانوں پر ہوتی ہے جو سب کچھ جانتے اور سب کچھ دیکھتے ہوئے ایسے لوگوں کی جذباتی تقریروں اور لچھے دار باتوں میں آکر اپنے ووٹوں کو ضائع کردیتے ہیں۔

ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ ایک غیر مسلم لیڈر نے پردہ کے بارہ میں ایک بیان دے کر لوگوں کو چونکا دیا، ہر طرف سے ان کے اس بیان کی مذمت کی گئی، جوان کے اپنے تھے، صفائی دینے کی ہمت ان کی بھی نہ پڑی، بیان واپس لینے اور مسلمانوں سے معافی مانگنے کا ان سے مطالبہ کیا گیا، تحریک چلانے کی دھمکی دی گئی، اور ان کے اس بیان کو مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے کے مرادف قرار دیا گیا، لیکن کسی نے ان گستاخ مسلمانوں سے کچھ نہ کہا جو سرعام پردہ کا مذاق اڑاتے ہیں، اور پردہ کو ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ قرار دیتے ہیں، کسی نے ان مسلم خواتین سے کچھ نہ کہا جو کھلے عام بے پردہ گھوم کر اُس غیر مسلم لیڈر کے بیان کی تائید کرتی ہیں۔

اردو کو لیجیے! کتنے شدومد سے ہم حکومت سے کہتے ہیں کہ اردو کو سرکاری درجہ دیا جائے، دفاتر میں آفیسرز کے نام کی تختی اردو میں لگادی جائے، بینکوں کو اردو میں لکھے گئے چیک قبول کرنے کا حکم دیا جائے، ایئرپورٹ، اسٹیشنس، بس اسٹینڈ اور دوسری عوامی جگہوں پر اردو کا ہندی کی طرح استعمال کیا جائے، لیکن خود ہم اردو کو گھریلو درجہ دینے کو بھی تیار نہیں، اپنے بچوں کو اردو سکھانے پر آمادہ نہیں، مسجدوں تک سے ہم نے اردو کو نکال دیا ہے، وضو خانہ میں پانی کے استعمال کے سلسلہ میں ہدایات ہندی میں ہوتی ہیں، موبائل کے سلسلہ میں ہدایات ہندی میں دی جاتی ہیں، اور ہندی کا بھوت اب اس حد تک ہم پر سوار ہوگیا ہے کہ بعض مسجدوں میں اللہ اور محمد بھی ہندی میں لکھا ہوا ملتا ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ہمارے اس جذباتی اور احتجاجی مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں اور آپ کو مخاطب کرتے ہیں:

”آپ کو عقل سلیم اور حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے، محض جذباتی ہونا کافی نہیں، مسلمانوں میں یہ کمزوری بہت دنوں سے ہے کہ وہ جذبات کی رو میں بہ جاتے ہیں اور سر کٹانے کی بات شروع کردیتے ہیں، ہمیں صحابہ کرامؓ کو نمونہ بنانا چاہیے، وہ تلوار کے دھنی اور جہاد کے جذبہ سے سرشار ہونے کے باوجود تیرہ (۱۳) سال تک مکہ مکرمہ میں تکلیفیں جھیلتے رہے، لیکن انہوں نے انگلی تک نہ ہلائی زبان سے اُف تک نہ کی، کیونکہ ان کو حکم تھا: ”كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ“ (ابھی صرف نماز پڑھو اور ہاتھ روکے رکھو) اور وہ ہر اس حکم کے پابند تھے جو خدا کی طرف سے اس کے رسول کے ذریعہ ان کو ملتا تھا، ان کا حال یہ تھا:

بھڑکتی نہ تھی آگ ان کی
شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا گرم گرما گئے وہ
جہاں کردیا نرم نرما گئے وہ

صحابہ کرامؓ شریعت کے پیچھے چلتے تھے، ہم نعروں کے پیچھے چلتے ہیں، انہوں نے سر جھکایا پھر کٹایا، ہم شریعت کے نام پر سر کٹانے کی بات تو کرتے ہیں لیکن شریعت کی خاطر سر جھکانے کے لیے تیار نہیں ہوتے، ہم ہنگامہ پسند، جلوس پسند،

جلسے پسند، مظاہرے پسند، نعرے بازی پسند، لیکن پُرسکون انداز میں، دستور اور قانون کے دائرہ میں، افہام وتفہیم کے راستہ سے ان مسائل کو حل کرنا شاید ہم اپنے لیے باعث عار اور کسر شان سمجھتے ہیں۔

عبادات کے معاملے میں یقیناً ہمارے اندر بڑی تبدیلی آئی ہے، سب کو اس کا اعتراف ہے اور خوشی بھی، حاجیوں کی تعداد ہر سال ماشاء اللہ بڑھتی جارہی ہے، نمازیوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے، زکوۃ دینے کا رواج بڑھ رہا ہے، رمضان کے مہینہ میں بے روزہ اکا دکا ہی نظر آتے ہیں اور وہ بھی شرماتے ہوئے، لجاتے ہوئے اور منہ چھپاتے ہوئے؛ پہلے گستاخی کا یہ عالم تھا کہ کہا جاتا تھا کہ وہ روزہ رکھے جس کے گھر میں کچھ کھانے کو نہ ہو، لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حاجیوں، نمازیوں، روزہ داروں اور زکوٰۃ دینے والوں کی تعداد بڑھنے کے باوجود ہمارے معاشرہ پر ان عبادتوں کے وہ اثرات مرتب نہیں ہورہے ہیں جو ہونے چاہیے، چنانچہ ہمیں اپنی نیتوں کا محاسبہ کرنا چاہیے اور ان رقومات کا بھی جائزہ لینا چاہیے جو ہم اس راہ میں خرچ کرتے ہیں، مفکر اسلامؒ نے ایک موقع پر فرمایا تھا: ''دل کے مسلمان ہونے کے ساتھ فکر اور ذہن کو بھی مسلمان ہونا چاہیے''۔

ایک پہلو اور جو ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ یہی وہ پہلو ہے جو دوسروں کے سامنے آتا ہے اور جس سے غیروں کو واسطہ پڑتا ہے اور یہی پہلوان کو ہم سے قریب بھی کرتا ہے اور یہی پہلوان کو ہم سے دور بھی کرتا ہے، اور یہ پہلو ہے معاملات اور اخلاق کا، ہمیں اپنے معاملات اور اخلاق کو خاص طور پر درست کرنے کی ضرورت ہے، ہم عبادات تو شریعت کے مطابق انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن معاملات میں ہم اپنی مرضی، رواج، مفاد، مصلحت اور ضرورت کو بنیاد بناتے ہیں۔

اخلاق و معاملات کی اہمیت کا اندازہ آپ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی اس تحریر سے لگا سکتے ہیں!

''یہاں جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مسلمان کو دیکھ کر مسلمان ہوئے، انہوں نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کو دیکھا تھا، خواجہ معین الدین چشتیؒ قطعاً مصنف نہ تھے، ان حضرات نے تصنیف وتالیف کے ذریعہ اور تقریر وخطابات کے ذریعہ دلوں کو نہیں جیتا، انہوں نے دلوں کو اپنے اخلاق سے جیتا ہے، قربانی اور ایثار سے جیتا، وہ جیت سکتے تھے لیکن ہار مان گئے، غصہ کا اظہار کرسکتے تھے لیکن غصہ پی گئے، گالی کا جواب گالی سے دے سکتے تھے لیکن گالی سن کر خاموش رہے، غریب کو سینے سے لگایا، خود بھوکے رہ کر دوسروں کو پیٹ بھر کے کھلایا، اور آج دیکھ لیجیے کہ ہندوستان میں جن مقامات پر سات سو برس تک، ہزار ہزار برس تک مسلمانوں کی حکومت رہی، وہاں آج تک اقلیت میں ہیں، یوپی، مدھیہ پردیش، بہار اور راجپوتانہ، رہا دلی وہ تو مسلم حکومتوں کا پایہ تخت رہا لیکن اس کے باوجود ان علاقوں میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے، لیکن مسلمان اکثریت میں کہاں ہیں؟ کشمیر میں ہیں، جہاں ایک اللہ کا بندہ سید علی ہمدانیؒ پہنچا، اور سارا کشمیر ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا، اسی طرح بنگال ہے، خاص طور پر مشرقی بنگال سارا کا سارا صوفیائے کرام کے حساب میں ہے''۔

یہی ہمارا پیغام ہے اور یہی ہماری دعوت، اجتماعیت پیدا کریں، جذباتیت سے پرہیز کریں، عبادات کے موقع پر نیتیں درست رکھیں، معاملات کو شریعت کے تابع کریں، اخلاق کو نبوی اخلاق کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کریں، یہی ہمارا سب سے مؤثر ہتھیار اور یہی ہماری سب سے مضبوط ڈھال ہے۔

☆☆☆☆☆

## جمہوریت اور انسانی مساوات

مولانا ابوالکلام آزادؒ

آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا، یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہونچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا، یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا سنگم تھا، یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے؛ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک شکم میں مل جانا پڑا، ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا، جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کردیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی، ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کردی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے، ہم نے اسے اسلام کے ذخیرہ کی سب سے زیادہ قیمتی چیز دیدی، جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی، ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہونچادیا۔ ☆☆☆

آدابِ معاشرت

# حسد انسان کو ہلاک کر دیتا ہے

مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

انسان کو اللہ تعالیٰ نے خیر و بھلائی کرنے کے لیے پیدا کیا ہے، انس و محبت اس کی خمیر میں رکھا ہے لیکن شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے وہ اسے اس کی اصل فطرت سے ہٹانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے اور یہی اس کا شیوہ اور وظیفۂ حیات ہے، اللہ عزوجل نے انسان کی آزمائش کے لیے شیطان کو اس کی قوت اور قدرت بھی عطا کی ہے لہٰذا وہ اپنی سرشت کے مطابق کام کرتا رہتا ہے اس کے خلاف پر اس کی طبیعت نہیں چل پاتی اس لیے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ''شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن بنا کر رکھو''۔

لیکن انسان غفلت کا شکار، نفس امارہ کا اسیر بن کر شیطان کے چنگل میں پھنس جاتا ہے، انسان سے غلطی کا ہونا یا کسی جرم کا ارتکاب یہ اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا اس جرم یا گناہ پر اس کا اصرار ہے، گناہ کے ارتکاب پر اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اس کا گناہ بھی معاف ہو جاتا ہے، اور یہ اس کے لیے رفع درجات کا سبب بن جاتا ہے، بشرطیکہ وہ صدق دل سے توبہ کرے، آئندہ گناہ سے باز رہنے کا عزم مصمم ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ایک روایتی عمل ہے، جو اللہ عزوجل کی بارگاہ میں قابل قبول نہیں، لہٰذا توبہ کرتے وقت اس امر کا لحاظ کرنا چاہیئے، بعض لوگ اور اکثر خواتین توبہ کے معنی یہ سمجھتی ہیں کہ منہ پر ہاتھ رکھ کر توبہ توبہ کہہ لیا جائے بس توبہ ہو جاتی ہے، اور نہ ہی کان پکڑ کر اٹھنے بیٹھنے سے توبہ کا عمل مکمل ہوتا ہے، توبہ تو وہ دلی کیفیت ہے جس سے دل کا زنگ دور ہوتا ہے اور انابت الی اللہ کے ساتھ خشوع و خضوع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور پھر عمل صالح میں لذت ملنے لگتی ہے بدی اور نافرمانی سے بیزاری اور نفرت معلوم ہوتی ہے۔

گناہوں میں سب سے خطرناک گناہ حسد ہے، حسد ایک آگ ہے جو محسود تک پہونچتی ہے اور پھر حاسد کو بھی جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، یہ وہ گناہ ہے جو سب سے پہلے آسمان پر سرزد ہوا ہے، حسد کی وجہ سے ابلیس نے حضرت آدمؑ کے خلاف سازش کی اور انہیں ان کے مقام بلند سے گرانے کی کوشش کی، اس میں وہ کامیاب بھی ہو گیا لیکن حضرت آدمؑ کی توبہ اور انابت نے انہیں پھر مقام رفیع پر فائز کر دیا، اور شیطان ملعون رسوا ہوا، یہی انسان کا کمال ہے، شیطان اس سے زیر ہوتا ہے، زمین پر بھی سب سے پہلا گناہ جو اجتماعی زندگی میں سامنے آیا وہ بھی حسد ہے، حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کے مابین جو اختلاف رونما ہوا اس کا بھی سبب حسد ہی تھا، ہابیل کی قربانی بارگاہ رب العزت میں قبول ہو گئی؛ لیکن قابیل کو شرف قبولیت حاصل نہ ہو سکی جس پر وہ چراغ پا ہو گیا، اور اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا، اور اس طرح رشتۂ اخوت کو حسد کی آگ نے خاکستر کر دیا، یہ پہلا قتل تھا جس کا سبب یا جس کی پاداش میں قیامت تک قتل کے گناہوں کا بوجھ اس کے سر پر ڈالا جاتا رہے گا۔

لہٰذا حسد سے بچنا چاہیے؛ لیکن یہ ایسی اجتماعی بیماری ہے جو انسان کے ہر طبقہ میں پائی جاتی ہے، کسی کی اچھی حالت دیکھ کر خوش نہ ہونا اس بیماری کا اصل سبب ہے، اس بیماری کا اسیر محسود کے لیے کنواں کھودتا رہتا ہے تاکہ وہ اس کو اس میں ڈھکیل کر اپنے نفسیاتی اضطراب کو تسکین دے سکے، لیکن وہ بھول جاتا ہے کہ کنواں کھودنے والا بھی خود کنویں میں گر سکتا ہے، اور پھر اس کی تباہی مقدر بن جاتی ہے، ایک بادشاہ کے دو مصاحب تھے، دونوں بڑے مقرب تھے لیکن بادشاہ ایک کو دوسرے کا مقابلہ میں کچھ زیادہ ترجیح دیتا تھا، یہ چیز اس کے نزدیک حسد کا باعث ہو گئی، اس نے چاہا کہ اس کو راستہ سے ہٹا دے اور تقرب کی بارگاہ میں اس کا کوئی شریک نہ ہو، ایک روز بادشاہ سے اس نے کہا: حضور یہ شخص جس پر آپ احسان فرماتے ہیں، آپ اس سے محبت کرتے ہیں؛ لیکن وہ آپ سے نفرت کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ جب آپ سے قریب ہوتا ہے تو اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ہے تاکہ آپ کے منہ کی بو اس تک نہ پہونچے، اور یہ اس کا حضور معمول ہے آپ نے شاید توجہ نہیں دی ہے، بادشاہ نے کہا آئندہ اس پر غور کروں گا، کیا وہ ایسا کرتا ہے۔

وہ شخص اسی وقت اس آدمی کے پاس گیا، جو اس کا دوست اور بادشاہ کا مصاحب بھی تھا، اس نے اس کو اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی اور باصرار اسی دن کی دعوت پر زور دیا، اس نے دعوت قبول کر لی، اس کے گھر آیا، کھانا جب پیش کیا گیا تو اس میں لہسن و پیاز کی کثرت تھی، ہر چیز میں کچی پکی پیازیں ڈالی گئی تھیں، کھانے سے فراغت کے بعد بادشاہ کے دربار میں حاضری بھی دینی تھی، لہٰذا یہ مصاحب جب دربار میں حاضر ہوا تو ذرا دور

بیٹھا، اور جب مجلس برخاست ہوئی تو بادشاہ سے کچھ دوری پر رہا، بادشاہ کو یاد آیا کہ فلاں نے اس کے بارے میں وہ بات کہی تھی، لہٰذا اس کو بلایا، بادشاہ کے قریب جب آیا تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا، تاکہ پیاز کی بو سے بادشاہ کو تکلیف نہ ہو، بادشاہ نے جب یہ دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ اس کے مصاحب نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ صحیح ہے، لہٰذا اس کو روک لیا اور اپنے ہاتھ سے ایک تحریر لکھ کر اس کے حوالے کیا اور کہا کہ کل وزیر اعظم کو پہونچا دینا، یہ شخص بہت خوش ہوا، اور یہ سمجھا کہ بادشاہ سلامت نے اس سے خوش ہو کر انعام واکرام سے نوازنے کے لیے یہ تحریر عطا کی ہے۔

دوسرا مصاحب جو بادشاہ کے دربار سے پہلے جا چکا تھا، وہ اس کے انتظار میں تھا، جب یہ دربار سے باہر آیا تو اس نے اس سے پوچھا کہ بادشاہ سلامت نے اسے کیوں روک رکھا تھا، اس نے کہا کہ بادشاہ سلامت نے اُسے یہ تحریر دی ہے تاکہ وزیر اعظم سے انعام واکرام حاصل کروں، ان شاء اللہ وزیر اعظم کی خدمت میں کل حاضر ہوں گا، اس مصاحب نے اسے بہلا پھسلا کر وہ تحریر حاصل کر لی، تاکہ اسے خود وہ لے کر جائے اور اکرام و نوازش کا سزاوار ہو، وہ بہت خوش تھا، اس کے دوست نے اس کو بند لفافے میں وہ تحریر دیا اس کے اصرار پر دیا تھا، سر بمہر لفافہ وہ کھول بھی نہیں سکتا تھا، وہ تمناؤں اور آرزوں کی حسین وادی میں کھویا ہوا تھا، اسے کیا پتہ تھا کہ تقدیر الٰہی کا اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہے،، صبح ہوتے ہی وزیر اعظم کے دربار میں حاضر ہوا اور وہ سر بمہر لفافہ اس کی خدمت میں پیش کیا، وزیر اعظم نے اس لفافہ کو کھولا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس میں یہ تحریر یہ کہ:

''حامل رقعہ ہذا کو فوراً قتل کر کے اس کی کھال میں بھس بھر کر میرے پاس لایا جائے''۔

وزیر اعظم نے وہ تحریر اسے سناتے ہوئے جلاد کو حکم دیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے، وہ بہت چیخا چلایا، معذرت کی اور یہ بھی کہا کہ بادشاہ نے یہ تحریر میرے لیے نہیں بلکہ دوسرے مصاحب فلاں کے لیے لکھی ہے، لیکن وزیر اعظم نے اس کی کوئی بات نہ سنی اور اسے قتل کر دیا گیا، اور بادشاہ کے سامنے اس کی لاش پیش کر دی گئی۔

دوسرے دن وہ مصاحب حاضر ہوا تو بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا، اس نے واقعہ کے تعلق سے استفسار کیا تو اس نے سارا ماجرا بادشاہ کی خدمت میں عرض کر دیا، بادشاہ نے سننے کے بعد ٹھنڈی سانس لی اور یہ کہنے لگا تم سچ کہتے ہو، تم اپنی ڈیوٹی پر واپس جاؤ، اس کو اس کے کرتوت کا بدلہ مل گیا اسی کو کہتے ہیں، چاہ کن را چاہ در پیش، یعنی کنواں کھودنے والا خود ہی اس میں گر جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

---

.....بقیہ صفحہ ۱۴ کا

اس موقع پر میں صرف امام غزالیؒ کے طویل مجاہدانہ زندگی کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں، جنہوں نے ایک مدت تک تدریسی شغل جاری رکھا، اور ہزاروں افراد کو فیض پہونچایا، لیکن ان کے دل میں کسی کمی کا احساس رہا، برابر اس کے تعلق سے فکر مند رہے، اور دس سال کا عرصہ اسی فکر میں گذارا، انہوں نے اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں اس کی پوری روداد لکھی ہے، اخیر میں انہوں نے پوری بے چینی کا تذکرہ کیا، دس سال کی ریاضت ومجاہدہ کے بعد ان کا احساس تھا کہ دل کا سکون اور اندرونی راحت کے لیے اہل اللہ سے تعلق اور تسبیح ومناجات میں مشغولیت نہایت ضروری امر ہے، وہ لکھتے ہیں:

وقد علمت أن الصوفية هم السالكون لطريق الله خاصة، وأن سيرهم أحسن السير و طريقتهم أصوب الطريق، وأخلاقهم أزكى الأخلاق، وأن تعاليمهم مقتبسة من مشكاة النبوة (مجھے معلوم ہوا کہ صوفیائے کرام ہی اللہ کے راستے پر چلنے والے ہیں، ان کا کردار بہترین کردار، ان کے منہج صحیح ترین منہج اور ان کے اخلاق پاکیزہ اخلاق ہیں، اور ان کی تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفاد ہیں)۔

بحمد اللہ دین کی حفاظت اور عالم اسلام کی ظاہری اور معنوی روح کو باقی رکھنے کے لیے اسلامی جذبہ سے سرشار افراد نے ہر زمانہ میں انتھک کوششیں صرف کیں، عسکری سطح پر دشمنوں کو شکست دی، نورالدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی کے صرف تذکرہ سے پوری تاریخ نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، کیونکہ صلیبی جنگوں میں شکست فاش کے بعد عیسائی دنیا نے اپنا موقف تبدیل کیا تھا، اور فکری یلغار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، ماضی قریب میں عالم اسلام کی اسلامی تحریکات اور اداروں نے اس کی روح کو باقی رکھنے میں غیر معمولی جد وجہد کی، جن میں اسلامی مزاج کے فروغ میں سنوسی تحریک، الاخوان المسلمون، تحریک دعوت وتبلیغ، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، مظاہر علوم، جمعیۃ العلماء، الجامع الأزہر، جامعہ زیتونہ، جامعہ قرویین، رابطہ عالم اسلامی وغیرہ نمایاں ہیں۔ ان کے ذریعہ علمی اور فکری ہر لحاظ پر حفاظت اسلام، اشاعت اسلام اور اقامت اسلام کا کام انجام پا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دوررس نتائج پیدا فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

ایمان وایقان

# حق وباطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ بدر

ڈاکٹر سراج الدین ندوی

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ واقع ہوا جسے ہم غزوہ بدر کے نام سے جانتے ہیں۔ غزوۂ بدر کوئی معمولی معرکہ نہیں تھا۔اس کا مقصد جہانگیری اور کشور کشائی نہیں تھا۔ کفار مکہ مدینہ میں موجود مسلمانوں کے دشمن اس لیے نہیں تھے کہ مدینہ کے مسلمانوں نے کفار مکہ کو کوئی جانی و مالی نقصان پہنچایا تھا، وہ تو الٹے مکہ چھوڑتے وقت اپنی زمین جائداد چھوڑ کر آئے تھے۔ نہ مسلمانوں نے اہل مکہ کے اقتدار کو چیلنج کیا تھا؛ بلکہ مسلمانوں کے قائد اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مشرکانہ عقائد پر تنقید کی تھی، معبودان باطل کی خدائی کا انکار کر دیا تھا اور ایک اللہ کی عبادت و حاکمیت کا اعلان کیا تھا۔اہل مکہ جن عقائد کو صدیوں سے درست مانتے آرہے تھے، پتھروں کے جن بتوں سے انھوں نے اپنی امیدیں باندھ رکھی تھیں اور جن کے آستانوں پر وہ نذر و نیاز پیش کرتے تھے، یک بیک انہی میں سے ایک شخص اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔اہل مکہ اس سے مصالحت کی کوشش کرتے ہیں اور اس بات پر راضی کرنا چاہتے ہیں کہ ایک دن ہم تمہارے معبود کی پوجا کرلیا کریں اور ایک دن تم ہمارے معبودوں کی پوجا کرلیا کرو، مگر وہ دوٹوک الفاظ میں کہہ دیتا ہے: ''اے منکرینِ حق! میں ان کی پرستش کر ہی نہیں سکتا جن کی تم کرتے ہو، تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور ہمارے لیے ہمارا دین''۔

غزوۂ بدر کی جو تفصیلات کتب سیرت میں ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے ۱۷/رمضان المبارک ۲ھ (۱۷/مارچ ۶۲۴ء) کو فجر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد کی تلقین کی۔مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش کا وقت تھا اس لیے کہ اپنے ہی بھائی بند سامنے کھڑے تھے۔حضرت ابوبکرؓ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے اور حضرت حذیفہؓ اپنے باپ عتبہ سے مقابلہ کرنا تھا۔صفیں درست ہوجانے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حضور سجدے میں گر گئے، اللہ کی تسبیح کے بعد آپؐ یوں گویا ہوئے: ''اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا ہے، وہ پورا فرما، اے اللہ! اگر آج یہ مٹھی بھر لوگ ہلاک ہوگئے تو پھر قیامت تک تمام روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا''۔[بخاری، مسلم، ترمذی، مسند امام احمد]

دعا کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران جنگ ایک مٹھی کنکر اٹھائی اور دشمن کے لشکر کی طرف پھینک دی، اس ریت کا ذرہ جس کافر پر بھی جا کر گرا اس جنگ میں وہ مارا گیا، سورہ انفال کی آیت ۱۷ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کنکر مارنے کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے: ''اور آپؐ نے (حقیقتاً وہ کنکر) نہیں پھینکی، جس وقت (بہ ظاہر) آپ نے (کنکر) پھینکی تھی، لیکن وہ (کنکر) اللہ تعالیٰ نے پھینکی''۔[الانفال: ۱۷]

جنگ کے آغاز پر عرب کے دستور کے مطابق پہلے انفرادی مقابلے ہوئے۔سب سے پہلے عمر بن حضرمی کا بھائی عامر میدان میں نکلا اور مدمقابل طلب کیا۔مقابلے پر حضرت عمرؓ کا ایک غلام نکلا اور اس نے چشم زدن میں اس مغرور کا خاتمہ کر دیا، جو اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے آیا تھا۔اس کے بعد عتبہ بن ربیعہ اس کا بھائی شیبہ اور اس کا بیٹا ولید بن عتبہ میدان میں نکلے اور مقابل طلب کیے۔تین انصاری صحابہؓ میدان میں نکلے لیکن ان تینوں کو کافروں نے یہ کہہ کر ان سے مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ ہمارے ہم پلہ نہیں ہیں اور پکار کر کہا: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہمارے مقابلے پر قریشی بھیجو۔ہم عرب کے چرواہوں سے مقابلہ کرنے کے لیے یہاں نہیں آئے ہیں۔'' چنانچہ آپؐ کے ارشاد پر حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ مقابلے کے لیے نکلے۔مغرور قریشی سرداروں نے ان کے نام پوچھے اور کہا: ''ہاں تم ہمارے ہم پلہ ہو'' مقابلہ شروع ہوا۔چند لمحوں میں حضرت حمزہؓ نے عتبہ کو، حضرت ابو عبیدہ نے شیبہ کو جہنم رسید کر دیا اور حضرت علیؓ نے ولید کو قتل کر ڈالا اور لشکر اسلام سے تکبیر کی آواز بلند ہوئی، قریش نے اپنے نامور سرداروں کو یوں کٹتے دیکھا تو یکبارگی حملہ کر دیا تاکہ اکثریت کے بل بوتے پر لشکر اسلام کو شکست دیں۔

غزوۂ بدر میں مومنین کے جوش جہاد کا یہ حال تھا کہ ایک صحابی کھجوریں کھا رہے تھے۔انہوں نے حضور اکرمؐ کا اعلان ''آج کے دن جو شخص صبر و استقامت سے لڑے گا اور پیٹھ پھیر کر نہ بھاگے گا وہ یقیناً جنت میں جائے گا''۔ سنا تو کھجوریں

پھینک دیں اور فرمایا: ''واہ واہ میرے اور جنت کے درمیان میں بس اتنا وقفہ ہے کہ یہ لوگ مجھ کو قتل کر دیں۔'' یہ کہہ کر اتنی بہادری سے لڑے کہ شہید ہوگئے اور چند لمحوں میں جنت کا فاصلہ طے کر لیا۔ اس ہنگامے میں انصار کے دو کم عمر بچے معاذ بن عمرو بن جموع اور معاذ بن عفراء، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے پاس آئے اور ان میں سے ایک نے کہا:

''چچا جان! آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں، وہ کہاں ہے؟ ہم نے سنا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گالیاں بکتا ہے۔ اس پاک ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر میں اس کو دیکھ لوں تو اس وقت تک اس سے جدا نہ ہوں گا جب تک کہ وہ مر نہ جائے یا میں شہید نہ ہو جاؤں''۔ یہی بات دوسرے نے کہی۔ اتفاق سے ابوجہل کا گزر سامنے سے ہوا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ اشارہ پاتے ہی یہ دونوں ننھے مجاہد اپنی تلواریں لے کر اس کی طرف بھاگے۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور یہ دونوں پیدل۔ جاتے ہی ان میں سے ایک نے ابوجہل کے گھوڑے پر اور دوسرے نے ابوجہل کی ٹانگ پر حملہ کر دیا۔ گھوڑا اور ابوجہل دونوں گر پڑے۔ عکرمہ بن ابوجہل نے معاذ بن عمرو کے کندھے پر وار کیا اور ان کا بازو لٹک گیا۔ باہمت نوجوان نے بازو کو راستے میں حائل ہوتے دیکھا تو پاؤں کے نیچے لے کر اسے الگ کر دیا اور ایک ہی ہاتھ سے اپنے شکار پر حملہ کر دیا۔ اتنے میں معاذ بن عفرا کے بھائی معوذ وہاں پہنچے اور انہوں نے ابوجہل کو ٹھنڈا کر دیا اور جنگ کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اللہ نے اس پہلے معرکے میں اہلِ ایمان کو شان دار فتح عطا فرمائی۔ پورے جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کی دھاک بیٹھ گئی اور کفر کی ہوا اکھڑ گئی۔ قریش کا رعب اور دبدبہ خاک میں مل گیا۔ مدینہ کے یہود اور منافقین مایوس ہوگئے، مگر ان کے دلوں کا کینہ اندر ہی اندر لاوا بن کر پکتا رہا۔ شکست کی خبر مکہ میں پہنچی تو پورا شہر سکتے میں آ گیا۔ کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا، جس کے افراد جنگ میں قتل نہ ہوئے ہوں یا مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی نہ بن گئے ہوں۔ لوگوں کے دلوں سے خوشی اور ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی، جنہیں چند سال پہلے تک مکہ کی وادیوں میں گھسیٹا جا رہا تھا وہ کمزوری و بے سروسامانی کے باوجود اپنے ایمان کی قوت سے اسلحے کی طاقت اور مادی وسائل پر غالب آ چکے تھے۔

ہزیمت کی خبر سننے کے بعد ایک بار تو مکہ کی فضائیں ماتم کے کہرام سے گونج اٹھی تھیں، مگر قریش کی قیادت نے فوراً اعلان کر دیا کہ مقتولین کا ماتم نہ کیا جائے؛ کیونکہ اس سے کمزوری کا اظہار ہوتا ہے، قریش کے تمام معروف سردار بدر کے میدان میں قتل ہو چکے تھے، اس لیے اب مکہ کا قائد بنو امیہ کا سردار ابوسفیان بن حرب تھا۔ خالد بن ولید، صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل اور عمرو بن عاص اس کے مشیر اور دست و بازو تھے۔ ابوسفیان نے نہ صرف آہ و بکا سے منع کیا تھا، بلکہ نوجوانوں کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ لوگوں پر نظر رکھیں اور کسی کو بلند آواز سے رونے نہ دیں۔ اس کا اپنا بیٹا حنظلہ، اس کا خسر عتبہ، اس کی بیوی کا بھائی ولید اور بہت سے دیگر رشتہ دار بدر میں لقمۂ اجل بن چکے تھے، اس نے خانہ کعبہ میں جا کر قسم کھائی کہ وہ جب تک مقتولین کا بدلہ نہ لے لے گا سر میں تیل نہیں لگائے گا، نہ ہی غسل کرے گا، شعراء نے مقتولین کے درد بھرے مرثیے لکھے۔

غزوۂ بدر صحابہ کرامؓ کے جوش ایمانی اور اللہ اور اس کے رسول سے محبت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اسی ایمان کی آج بھی ضرورت ہے۔ اپنے ایمان کو مضبوط کیجیے۔ اللہ کی قدرت پر یقین رکھیے۔ رمضان کے مہینے میں بھی اگر اللہ پر ایمان، اللہ کے رسول سے محبت اور اسلام کے غلبہ کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تو پھر یہ روزہ نہیں فاقہ ہے۔ آج ہمارے سامنے اگرچہ کوئی میدان قتال نہیں ہے؛ لیکن مومن کے سامنے انسانی معاشرے میں ہر وقت کوئی نہ کوئی شیطان رہتا ہے۔ اس شیطان سے جنگ کرنا ایک مومن کے لیے ضروری ہے، نفس امارہ خود ایک شیطان ہے، پھر ہر سماج میں ظالم رہتے ہیں جو غریبوں کو ستاتے ہیں، اس ظلم کے خلاف کھڑا ہونا ضروری ہے۔ غزوۂ بدر سے ایک مومن کو یہ حوصلہ ملتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے بھوک پیاس کی شدت برداشت کر کے ظالموں کے چھکے چھڑا دیے تھے تو ہم کیوں نہیں میدان مار سکتے۔ اللہ جب ۳۱۳ صحابہ کی مدد کے لیے فرشتوں کی جماعت بھیج سکتا ہے تو ہمارے لیے کیوں نہیں بھیج سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہمیں اپنے دعوائے ایمان میں سچا اور مخلص ہونا چاہیے، اللہ نے اسی شرط پر وعدہ فرمایا ہے: ''تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مومن ہو''۔ [آل عمران ۱۳۹] بقول شاعر:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

☆☆☆☆☆

علوم وفنون

# صحیح مسلم کے امتیازات وخصوصیات

مولانا فخر الدین طیب ندوی

## محدثین کرام کے کارنامے

علم حدیث کی تدوین، تاریخ اور علوم وفنون کا تفصیلی جائزہ لینے سے بخوبی انداز ہوتا ہے کہ محدثین کرام نے جو بے مثال کام کیا ہے، اس پر وہ امت کی طرف سے کتنے شکریے اور کتنے غیر معمولی امتنان واحترام کے مستحق ہیں، اللہ رب العزت نے ان کو جس اہم اور عظیم الشان کام کے لیے منتخب فرمایا ہے، وہ صرف اسلام کی تاریخ میں نہیں؛ بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ میں ایک نہایت منفرد نوعیت کا کام ہے، انھوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی مثال انسانوں کی فکری اور تہذیبی تاریخ میں نہیں ملتی، یہ سارا کام جو دراصل ملت اسلامیہ کی فکری اور تہذیبی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، آج وہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔

احادیث کے مجموعے عام کتابوں اور عام مجموعے مضامین سے مختلف ہیں، عام کتاب جب کوئی شخص لکھتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کتب خانہ میں بیٹھ کر بہت سی کتابوں کو سامنے رکھ کر تحقیق کرتا ہے، اور چند مہینے اور چند سال کی محنت کر کے ایک کتاب تیار کر لیتا ہے، احادیث کے مجموعے اس طرح تیار نہیں ہوئے، وہ جس غیر معمولی مشقت و جانفشانی اور جن غیر معمولی دور دراز کے سفروں کے نتیجہ میں تیار ہوئے ہیں ان سے اصحاب علم وفن بخوبی واقف ہیں، اس لیے جب بھی احادیث کی ان کتابوں کا تعارف یا اس مبارک موضوع کا تذکرہ کیا جائے گا تو ساری کاوشیں اور محنتیں جو ابتدائی تین چار صدیوں میں ہوئیں وہ ہمارے سامنے رہنی چاہئیں، حدیث کی کوئی کتاب بظاہر چھوٹی سی ہوگی ، اس میں احادیث کی تعداد چند ہزار یا چند سو ہوگی، لیکن ان چند ہزار یا چند سو احادیث کا مجموعہ ہم تک پہونچانے کے لیے ان حضرات کو کیا کچھ کرنا پڑا، اس کی تفصیلات تاریخ علم حدیث کا وہ زریں باب ہے، جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

## مجموعۂ احادیث میں سب سے مستند و معتبر صحاح ستہ

جب سے فن احادیث کی تدوین کا کام شروع ہوا، احادیث کے مجموعے آہستہ آہستہ منظر عام پر آنے لگے، اور حدیث کی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں، اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک اس مبارک علم کی اجتماعی اور انفرادی خدمت ہوتی رہے گی، ان میں کچھ کتابوں کو بہت زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، امت نے ان پر مکمل اعتماد کیا، اور ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ان میں سب سے ممتاز چھ کتابیں ہیں جن کو محدثین کی اصطلاح میں صحاح ستہ کہا جاتا ہے، جن کے نام ترتیب وار حسب ذیل ہیں:

۱- صحیح بخاری ( ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ ۱۹۴-۲۵۶ھ )۔

۲- صحیح مسلم (ابو الحسن مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری رحمہ اللہ ۲۰۴-۲۶۱)۔

۳- سنن أبی داؤد ( أبوداؤد سلیمان بن أشعث رحمہ اللہ ۲۰۲-۲۷۵)۔

۴- جامع الترمذی ( أبوعیسی محمد بن عیسی ترمذی رحمہ اللہ ۲۰۹-۲۷۹)۔

۵- سنن نسائی ( أبوعبد الرحمٰن أحمد بن شعیب رحمہ اللہ ۲۱۵-۳۰۳)۔

۶- سنن ابن ماجہ ( أبوعبد اللہ محمد یزید بن ماجہ ربعی قزوینی رحمہ اللہ ، معروف بابن ماجہ ) (۲۰۹-۲۷۳)۔

علماء اسلام اور امت مسلمہ نے ان چھ کتابوں کی صحت پر اعتماد کیا ہے اور انھیں تمام کتب احادیث میں سب سے زیادہ معتبر ومستند قرار دیا ہے، اگر چہ صحیحین کے علاوہ دیگر چار کتب سنن میں کچھ ضعیف احادیث بھی پائی جاتی ہیں، کچھ پر ان کے مصنفین نے ہی متنبہ کر دیا ہے، اور باقی ضعیف احادیث کو دوسرے علمائے کرام اور شارحین نے بیان کیا ہے۔

## صحیحین کا مقام اور ان کا امتیاز

صحاح ستہ میں سب سے زیادہ مقبولیت صحیحین کو حاصل ہے، اس پر امت کا تقریباً اجماع ہے، تمام سلف وخلف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کتاب اللہ کے بعد ( صحیح بخاری وصحیح مسلم ) کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی کتاب اس درجہ اور مرتبہ کی نہیں، چہ جائیکہ ان سے اصح ہو، کیونکہ شیخین نے صحیحین کی ترتیب میں جن اصولوں کا اہتمام کیا ہے، جن شرطوں کو ملحوظ رکھا ہے اور جن پابندیوں کا التزام کیا ہے وہ دوسرے محدثین کے یہاں نہیں ملتی ہیں، ان دونوں کتابوں کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں صرف صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام کیا گیا ہے، وہ صحیح حدیث جو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف کے مطابق

ہو، چنانچہ حافظ ابن حجر اپنی مشہور کتاب " نخبة الفكر" میں صحیح حدیث کی یوں تعریف کرتے ہیں:

" بنقل عدل تام الضبط متصل السند غير معلل و لا شاذ " (صحیح حدیث اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو ایسے راوی نے نقل کیا ہو جو عادل ہو، جس کا حافظہ کامل ہو، اس کی سند متصل ہو، یعنی سند میں کہیں انقطاع یا امکان انقطاع بھی نہ ہو) اور اس میں کوئی علت قادحہ خفیہ نہ ہو (یعنی ایسی پوشیدہ خرابی اور کمزوری نہ ہو جس سے حدیث کی صحت متاثر ہوتی ہو) اور وہ حدیث شذوذ سے محفوظ ہو، (یعنی اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہوں اور وہ اپنے سے اوثق کی مخالفت نہ کرتے ہوں) علامہ ابن حجر نے حدیث صحیح کی جو تعریف کی ہے وہ بہت مشہور و معروف ہے، محدثین کے نزدیک معتبر اور مستند ہے، اسی تعریف کے مطابق صحیح اور غیر صحیح حدیث کے درمیان فرق کیا جاتا ہے، لیکن شیخین نے اپنی تصنیف میں ان صفات کے علاوہ مزید اور شرطیں بھی لگائی ہیں، تاکہ یہ صفات اور مضبوط ہو جائیں، کچھ شرطیں تو ایسی ہیں جن میں امام بخاری منفرد ہیں، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں، یہاں تک کہ امام مسلم کے یہاں بھی وہ شرط نہیں پائی جاتی ہے، چنانچہ علامہ ابن حجر اپنی کتاب " نخبة الفكر "میں لکھتے ہیں:

وأما رجحانه من حيث الاتصال فلا شتر اطه أن يكون الراوى قد ثبت له لقاء من روى عنه ولو مرة، واكتفى مسلم بمطلق المعاصرة ،(امام بخاری کو امام مسلم پر ترجیح اس لیے بھی حاصل ہے کہ امام بخاری سند کے متصل ہونے کے لیے یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ راوی اور مروی عنہ کا صرف ہم عصر ہونا کافی نہیں ہے بلکہ دونوں کی ملاقات بھی ہونا ضروری ہو، اگرچہ ایک ہی مرتبہ ہو، جبکہ امام مسلم کے یہاں دونوں کی لقاء کی شرط نہیں صرف معاصرت کافی ہے) اسی طرح اور بھی کئی شرطیں ہیں جو امام بخاری کے یہاں پائی جاتی ہیں اور امام مسلم کے یہاں نہیں پائی جاتیں، لیکن اس کے باوجود بعض علماء کے درمیان یہ بات مختلف فیہ ہے کہ صحیحین میں افضل اور زیادہ معتبر کون ہے؟ بہت سے علماء اور محققین کے نزدیک صحیح مسلم صحیح بخاری سے اصح ہے، چنانچہ متقدمین میں سے بعض مغاربہ اور بعض محققین نے صحیح مسلم کو بے حد پسند کیا ہے، اور اس کو صحیح بخاری پر ترجیح دیا ہے، اور حافظ ابوبکر صاحبِ مدخل امام ابوعبدالرحمٰن نسائی نے کہا ہے کہ امام مسلم کی صحیح امام بخاری کی صحیح سے عمدہ ہے، ابوعلی نیشاپوری کا قول ہے کہ:

"ما تحت أديم السماء أصح من كتاب مسلم " (روئے زمین پر صحیح مسلم سے زیادہ اور کوئی صحیح کتاب نہیں ہے) اگرچہ علامہ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے، اور کہا ہے کہ اس قول سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحیح مسلم سے اصح کوئی دوسری کتاب نہیں ہے، لیکن صحیح مسلم کا صحیح بخاری سے اصح ہونا اس سے ثابت نہیں ہوتا؛ لیکن جمہور علماء کا قول ہے کہ بعض اعتبار سے صحیح بخاری فائق ہے اور بعض اعتبار سے صحیح مسلم، چنانچہ حافظ عبدالرحمٰن بن علی الربیع الیمنی الشافعی نے اسی بات کو مندرجہ ذیل اشعار میں پیش کیا ہے:

تنازع قوم فى البخارى ومسلم
لدىّ وقالوا أىّ ذين يقدم
فقلت :لقد فاق البخارى صحة
كما فاق فى حسن الصناعة مسلم

(صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی افضلیت اور اصحیت کے بارے میں لوگوں کا اختلاف میرے سامنے آیا تو میں نے کہا کہ صحت میں صحیح بخاری فائق ہے اور حسن ترتیب میں صحیح مسلم کا جواب نہیں) ان اقوال سے قطع نظر تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حسن ترتیب اور فن حدیث کو مہارت سے پیش کرنے میں امام مسلم کا جواب نہیں، انھوں نے حدیث کو ایسی مہارت اور حسن وخوبی سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والوں کے اندر حدیث کا صحیح ذوق وشوق اور اس سے سچی محبت وعشق پیدا ہو جائے۔

## صحیح مسلم کا مقام اور اس کا امتیاز

صحیح مسلم مذکورہ بالا اقوال کے باوجود محدثین اور جمہور علماء کے نزدیک بالاتفاق حدیث کی اہم ترین کتاب ہے، اور دنیا کی تمام کتابوں میں قرآن کریم اور صحیح بخاری کے بعد تیسری سب سے صحیح کتاب ہے، یہ کتاب جس محنت شاقہ سے ترتیب دی گئی ہے جس کا اندازہ تو اس کا مطالعہ کرنے سے ہو سکتا ہے، اسی وجہ سے امام موصوف کو اپنی صحیح پر بڑا ناز تھا، وہ خود فرماتے ہیں:"ولو أهل الحديث يكتبون مأة سنة فمدارهم هذاالمسند" (محدثین اگر سو سال تک حدیث لکھتے رہیں تو بھی اس مسند کے محتاج رہیں گے) حافظ ابن مندہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:" سمعت أبا على النيشابورى يقول ما رأيت تحت أديم السماء أصح من كتاب مسلم"، امام مسلم کی فن حدیث میں مہارت اور ان کی صحیح کی شان اتنی عظیم ہے جس کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

## صحیح مسلم کی امتیازی خصوصیات

صحیح مسلم کی وہ خصوصیات جو اس کو دوسری تمام کتب احادیث سے ممتاز کرتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

### ۱- پہلی خصوصیت

حسن ترتیب، یہ مسلم شریف کی سب سے اہم

اور ممتاز خصوصیت ہے، امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک موضوع سے متعلق تمام احادیث جو ان کی شرط کے مطابق تھیں، ایک جگہ جمع کردی ہیں، اس سے حدیث پڑھنے والے طلباء اور متخصصین فی الحدیث کو بڑی سہولت اور فن حدیث کا ذوق پیدا کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، دوسری کتب احادیث میں یہ خصوصیت شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

## ۲-دوسری خصوصیت

حسن ترتیب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک موضوع کی احادیث کو ایک باب میں اس ترتیب سے جمع کیا ہے کہ ہر آنے والی حدیث سابق حدیث کی شارح ہے، چاہے وہ کسی لفظ کی لغوی تشریح ہو یا کسی معنی کا اجمالی مفہوم ہو، نحوی ترکیب کی تحلیل ہو یا صرفی قواعد کی تعلیل، سند میں کسی راوی کے نام، کنیت، لقب یا نسبت سے متعلق کوئی تشنگی ہو یا متن میں کوئی معنوی الجھن، باب کی تمام احادیث پڑھتے جایئے تمام تشنگی اور الجھنیں بہت حد تک دور ہوتی جائیں گی، ہر آنے والی حدیث میں لفظ کا مترادف ملتا جائے گا، راوی کی کنیت کی جگہ اس کا نام آئے گا یا اور کوئی وضاحت ضرور آئے گی، مثال کے طور پر کتاب الایمان کی سب سے پہلی حدیث، حدیث جبریل ہے، اس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان، اسلام، احسان اور بہت سے امور کے بارے میں سوال کیا تھا، تو آپ نے پہلی حدیث میں ما الاحسان کے جواب میں فرمایا: أن تعبد اللّٰہ کأنك تراہ، و ان لم تکن تراہ فانه یراك، امام صاحب نے دوسری حدیث میں (أن تخشیٰ اللّٰہ) لاکر اس ٹکڑہ (أن تعبد اللّٰہ) کی مزید وضاحت فرمادی اور معنی میں یہ وسعت پیدا کردی کہ احسان صرف عبادت میں مطلوب نہیں ہے بلکہ ایک مؤمن سے ہر کام میں وہ مطلوب ہے جو ثواب کی نیت سے کیا جائے، اسی طرح (وما أشراطها) کے جواب میں پہلی حدیث میں آپ نے فرمایا کہ: (أن تلد الأمة ربتها) امام صاحب دوسری حدیث میں اس کی جگہ اذا رأیت المرأة تلد ربها، اور ایک اور روایت میں (أن تلد الأمة بعلها) لاکر واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ پہلی روایت میں (أن تلد الأمة ربتها) کا کیا مطلب ہے، اسی طرح کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہلی حدیث میں جو بھی مضمون جس انداز سے بیان کیا گیا ہو، امام صاحب علیہ الرحمہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کے بعد ایسی حدیث لائی جائے جسمیں مضمون وہی ہو لیکن جملہ بدلا ہوا ہو، یا تعبیر دوسری ہو، اسی طرح کسی حدیث میں کسی مضمون کو بیان کرنے کے لیے اگر جملہ اسمیہ استعمال گیا ہے تو اس کے بعد آنے والی حدیث میں اسی معنی کو ادا کرنے کے لیے جملہ فعلیہ والی حدیث لانے کی کوشش کی گئی ہوگی، گویا باب کی پوری احادیث پڑھنے کے بعد اصل مضمون اور اس کا اجمالی مفہوم سامنے آجاتا ہے یہ کمال مہارت کی بات ہے۔

## ۳-تیسری خصوصیت

امام صاحب رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کی تالیف میں انتہائی حزم واحتیاط اور کامل ورع وتقویٰ سے کام لیا ہے، بہت سے محدثین حدیث روایت کرنے کے صیغے مثلاً حدثنا، حدثنی، أخبرنا، أخبرنی وغیرہ کے درمیان فرق نہیں کرتے لیکن امام صاحب رحمہ اللہ ان الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیتے ہیں، جہاں اس کا تقاضا ہے وہیں استعمال کرتے ہیں، یہ ان کے اعلیٰ درجہ کے ذوق اور حدیث بیان کرنے میں کمال درجہ کی احتیاط وامانت کی دلیل ہے، یہ احتیاط بہت کم محدثین کے یہاں ملتی ہے، اگرچہ متقدمین محدثین کے یہاں ان صیغوں کے استعمال میں یہ گنجائش ہے کہ ایک صیغہ کو دوسرے صیغہ کی جگہ استعمال کرسکتے ہیں؛ لیکن امام صاحب نے رخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کرنے کو پسند فرمایا۔

## ۴-چوتھی خصوصیت

امام مسلم رحمہ اللہ کے تقوی وامانت داری اور حدیث پاک کے تقدس نیز اس سے اعلی درجہ کے عشق کی دلیل ہے کہ وہ اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ سلسلہ احادیث کے دوران احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی اپنی بات داخل نہ کی جائے، اس لیے آپ نے ایک موضوع کی تمام احادیث ایک جگہ جمع کرکے قارئین کے حوالہ کردیا، سلسلہ حدیث کے درمیان اپنی طرف سے کوئی ترجمۃ الباب قائم نہیں کیا، اور نہ ہی حدیث سے مستنبط ہونے والے فقہی مسائل، تشریحی جملے، علماء کے اقوال یا سندی بحثوں کو چھیڑا، شاید امام مسلم رحمہ اللہ کا یہ ماننا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال وتقریرات مبارک کے درمیان کسی اور کا کلام آنا حدیث پاک کی بے ادبی ہے، جبکہ دوسرے محدثین کے یہاں بغیر تبویب کے کوئی حدیث پیش ہی نہیں کی جاتی، صحیح مسلم کے جتنے قدیم نسخے پائے جاتے ہیں ان کے حاشیے پر جو ابواب ہیں وہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یا دوسرے شارحین مسلم شریف نے قائم کئے ہیں، اور آج کل جو نئے انداز کے نسخے چھپ کر آرہے ہیں ان میں ترجمۃ الباب کو روایتوں کے ساتھ اس طرح ضم کرکے لکھا جارہا ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ روایتوں کی طرح یہ تراجم بھی امام صاحب علیہ الرحمہ کے قائم کردہ ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ مندرجہ بالا وضاحت سے معلوم ہوگیا۔

**۵- پانچویں خصوصیت**

متعلمین اور قارئین کے اندر حدیث کا صحیح ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے اور یہ کہ وہ حدیث کو صرف حدیث سمجھ کر پڑھیں، اس کو کسی اور فن کے سانچے میں ڈھال کر نہ پڑھیں، تاکہ طالبان حدیث کے اندر حدیث اور صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقی عشق اور سچی محبت پیدا ہو، اس کے لیے ضروری تھا کہ قارئین و متعلمین کے سامنے صرف متن کو حدیث پیش کیا جائے اور مؤلف کی طرف سے کسی حدیث پر کوئی تبصرہ نہ کیا جائے، اور فقہی مسالک، ائمہ کے اختلاف اور ان کے دلائل نیز دیگر مباحث کو نہ چھیڑا جائے، تاکہ ان میں حدیث کی روح منتقل ہو سکے، امام مسلم رحمہ اللہ نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے، اور اس کا بھر پور اہتمام کیا ہے، جبکہ دوسری بہت سی کتب احادیث میں یہ خصوصیت شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

**۶- چھٹی خصوصیت**

امام مسلم رحمہ اللہ ایک حدیث کے کئی کئی طرق اور اسانید میں پیش کرتے ہیں، اور ان اسانید میں تحویلات بھی کثرت سے لاتے ہیں، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ مسلم شریف میں جتنی کثرت سے تحویلات ہیں اس کی مثال دوسری کتب احادیث میں نہیں ملتی، جس حدیث میں مختلف طرق اور تحویل اسانید ہوتی ہے، اس کو امام مسلم رحمہ اللہ اختصار کے ساتھ نہایت عمدہ عبارت میں پیش کرتے ہیں، نیز اگر اس میں راویوں کے درمیان لفظ اور تعبیر کا اختلاف ہوتا ہے تو واللفظ لفلان کہہ کر اس بات کی صراحت کر دیتے ہیں کہ حدیث میں مذکور الفاظ کس راوی کے ہیں۔

**۷- ساتویں خصوصیت**

امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کے جمع و ترتیب میں اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ اس میں صرف مرفوع حدیثیں جمع کی جائیں، اور راوی بھی سب کے سب ثقہ ہوں اور ان کی صحت پر علماء کا اتفاق ہو، موقوف احادیث اور آثار صحابہ سے حتی الامکان احتراز کیا جائے، اسی لیے اس مجموعہ میں موقوف احادیث اور صحابہ کے آثار شاذ و نادر ہی ملیں گے، اگر کہیں ہیں بھی تو وہ ضمناً ہیں اصالۃً نہیں، اور اس کی تعداد بھی بہت کم ہے۔

**۸- آٹھویں خصوصیت**

امام مسلم علیہ الرحمۃ نے اپنی صحیح میں مکررات سے بہت حد تک اجتناب کیا ہے، جہاں کہیں بھی کوئی حدیث بظاہر مکرر نظر آتی ہے یا تو اسکے الفاظ بدلے ہوئے ہوں گے یا وہ حدیث دوسری سند سے لائی گئی ہوگی، یا مضمون حدیث میں کچھ نہ کچھ حذف واضافہ کیا گیا ہوگا یا مدار سند میں تبدیلی ہوگی، الغرض کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور ہوگی، من وعن وہی حدیث اسی سند سے انھیں الفاظ کے ساتھ مروی نہیں ہوگی، اس کا تذکرہ خود امام مسلم رحمہ اللہ نے کتاب کے مقدمہ میں تفصیل سے کیا ہے، یہ خصوصیت دوسری کتب احادیث میں عام طور پر نہیں ملتی۔

**۹- نویں خصوصیت**

امام مسلم نے سند حدیث میں راویوں کے اسماء کے ضبط کا بھی بڑا خیال رکھا ہے، اگر کسی راوی کا اصل سند میں صرف نام ذکر کیا گیا ہو اور نسب کا ذکر نہ ہو، جس کے سبب اکثر ابہام پیدا ہو جاتا ہے، امام مسلم رحمہ اللہ اس کی وضاحت کرتے ہیں، مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ استاذ کے بیان کیے ہوئے الفاظ میں خلل نہ آئے، مثلاً انھوں نے ایک سند بیان کی حدثنا سلیمان یعنی ابن بلال عن یحیی وھو ابن سعید، اس مقام پر استاذ نے سلیمان بن بلال کا نام صرف سلیمان اور یحیٰی بن سعید کا نام صرف یحیٰی ذکر کیا تھا اور انکی ولدیت کو ظاہر نہیں کیا تھا امام صاحب چاہتے تو اس کو سلیمان بن بلال اور یحیٰی بن سعید کے نام سے ذکر کر سکتے تھے؛ لیکن اس صورت میں یہ وہم ہوتا کہ شاید استاذ نے اپنی سند میں ان کا ذکر اسی طرح کیا ہے، اس لیے امام صاحب نے اعلیٰ درجہ کی احتیاط کرتے ہوئے یہ تعبیر اختیار فرمائی، اسی طرح راوی کی کنیت اور صفت میں بھی یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

**۱۰- دسویں خصوصیت**

امام صاحب نے اپنی صحیح میں تعلیقات کو کم سے کم جگہ دی ہے، جبکہ امام بخاری علیہ الرحمہ کی صحیح میں تعلیقات کی کثرت ہے، حافظ ابن صلاح نے صحیح مسلم میں تعلیقات کی کل تعداد صرف چودہ (۱۴) بتائی ہے، جس کی فہرست بھی انھوں نے پیش کی ہے، حافظ ابن صلاح لکھتے ہیں کہ یہ چودہ تعلیقات اگرچہ منقطع سند سے مروی ہیں لیکن یہ احادیث دوسری متصل سند سے بھی مروی ہیں، اس لیے یہ روایات بھی حکماً صحیح اور موصول ہیں۔

یہ ہیں صحیح مسلم کی وہ چند خصوصیات وامتیازات جو اس کو دوسری تمام کتب احادیث سے ممتاز کرتی ہیں، یہاں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ مذکورہ بالا صفات و خصوصیات سرسری طور پر ذکر کی گئی ہیں، جب کہ امام مسلم رحمہ اللہ اور ان کی صحیح کی خصوصیات وامتیازات اتنے ہیں کہ ان کا احاطہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، تاہم ان ہی خصوصیات و امتیازات کے پیش نظر یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ صحیح مسلم حسن ترتیب اور احتیاط میں دنیا کی تمام کتابوں میں ممتاز اور ان سب پر فائق ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام امت کی طرف سے امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کو جزاء خیر عطا فرمائے، انکی قبر پر نور کی بارش فرمائے، فجزاہ اللہ خیرا الجزاء۔

☆☆☆☆☆

اصلاحِ حال

# اخلاق واعمال کا فساد اور اس کے نتائج

محمد عثمان خان ندوی

اسلام دین فطرت ہے اور زندگی گزارنے کا مکمل ضابطہ بھی، یہ زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی مکمل رہنمائی کرتا ہے، چاہے اجتماعی زندگی ہو یا انفرادی، خرید وفروخت ہو یا سماجی ومعاشرتی معاملات، زندگی میں خوشی ہو یا غم کے لمحات، غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں اسلام اسکی مکمل رہنمائی نہ کرتا ہو، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان دنیا اور آخرت میں اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب وہ ایک سچا مسلمان بن کر اپنی زندگی کو مکمل طور سے اللہ اور اسکے رسول کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق گزارے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی امت کو بہترین اخلاق کی تعلیم دی ہے، آپ ایسے پیشوا اور رہبر تھے جنہیں اللہ رب العزت نے بیک وقت دینی ہدایت، رہنمائی اور اخلاقی تربیت واصلاح کے لیے دنیا میں مبعوث فرمایا تھا، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے: "إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق"

اسی بناء پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیروکاروں کے عقائد کی درستگی کیساتھ ساتھ ان کے سماجی، معاشرتی، اور اخلاقی اعلیٰ کردار کی بہتر سے بہتر درستگی پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اگر آپ کی تعلیمات کو صحیح معنوں میں اپنایا جائے تو آپس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہوگا، اور سبھی رواداری اور ایک دوسرے کی رعایت کا خیال کرتے ہوئے ایک دوسرے کی عزت اور احترام کریں گے، اور بچے ماں باپ کا ادب کریں گے اور بڑا اپنے چھوٹے سے نرمی کا معاملہ کرے گا، اور چھوٹا اپنے بڑے کا ادب واحترام کرے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

اگر اسلام کے ابتدائی دور پر نظر ڈالیں تو اس وقت مسلمان اپنے دین اسلام کا سچا عملی پیکر تھا، وہ اپنے کردار سے اسلامی سیرت کا داعی تھا اور فطرت کے مطابق بلند اخلاقی بنیاد پر لوگوں کی تربیت کرتا تھا، لیکن آج ہم اپنے اصل مقام سے ہٹ کر اخلاق وکردار کی گراوٹ کی وجہ سے پستی کی طرف گامزن ہیں، موجودہ معاشرہ میں ہماری پہچان اور تصویر ایک ایسے انسان کی ابھر کر سامنے آتی ہے جو ہر خوبی اور ہر اچھے کردار اور اخلاقی قدروں سے عاری ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ کردار سے سارا علاقہ متاثر تھا، جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی وہ تو فوراً ہی ایمان لے آئے اور ان کے لیے آپ کی نبوت کا اعتراف گویا ایک 'حقیقتِ منتظر' کا اعتراف تھا، انہیں دعوت قبول کرنے کے لیے کسی بھی دلیل کی ضرورت نہیں تھی، چونکہ دلیل خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ کردار تھا جنہوں نے آپ کو ذرا دور سے بھی دیکھا تھا، وہ بھی آپ کی دیانتداری، امانت، شرافت، اور صداقت کے معترف تھے۔ خود کفار مکہ آپ کو امین کہتے تھے۔

ایک صاحب علم نے لکھا ہے کہ: ''اخلاقی اقدار انسانیت کا سرمایہ ہے جو قدیم زمانہ سے سے چلی آرہی ہیں، اور ہماری زندگی میں ہر چیز اخلاقیات پر مبنی ہے، امانت داری، دیانت داری، غیر جانبداری، خودداری، صلہ رحمی، وضع داری، اور حساس ذمہ داری اور وفاداری وغیرہ ایسی اخلاقی صفات ہیں جو انسانوں کے اندر ہونی لازمی ہیں''۔

## تربیت و تنظیم افراد

اسلامی انقلاب کی تبلیغ کی حقیقی بنیاد قول صالح سے زیادہ عمل صالح پر قائم ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا عملی نمونہ اپنے کردار سے پیش کیا، اور جب اسلام عرب کی سرزمین سے نکل کر باہر کی دنیا میں پھیلا تو لوگ مسلمانوں کے کردار اور ان کے اخلاق حسنہ دیکھ کر اسلام کی حقانیت کے معترف ہوتے چلے گئے، پہلے وہ مسلمانوں کو دیکھ کر ان کے عمل واخلاق سے مرعوب ہوتے، پھر اسلام سے متاثر ہوتے بالآخر اسلام ہی کو اس اخلاق کا حقیقی سبب سمجھتے اور اسے محبوب ومطلوب جان کر اس کے معتقد ہوجاتے، اور اسکی بنیادی تعلیم معلوم کرکے اس کے دائرے میں داخل ہوجاتے۔

آج ہمارے معاشرہ میں جہاں کہیں بھی سیاسی اور معاشرتی مسائل موجود ہیں، وہیں بڑھتا ہوا اخلاقی انحطاط بھی بڑا چیلنج بنا ہوا ہے۔ جنسی واخلاقی جرائم مغربی دنیا کے لیے تو کوئی نئی بات نہیں تھی، مگر مسلم معاشرے میں ان مکروہ اعمال کی وجہ سے معاشرتی تنزلی عیاں ہے، جدیدیت کی مصنوعی دنیا

میں کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کے بغیر اسمارٹ فون، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا آج کے دور میں وہ تباہی مچا رہے ہیں جس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اگر یہی صورت حال رہی تو پورے ملک کا اخلاقی وسماجی مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا، اس لیے ہمیں اس کے لیے سب سے پہلے اخلاقیات کی تربیت اپنے گھر سے شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی سرگرمیوں اور ان کے دوستوں پر نظر رکھنے کی سخت ضرورت ہے، خدانا خواستہ کہ کہیں وہ نا سمجھی میں غلط لوگوں کیساتھ تو شامل نہیں ہیں۔ بچے اگر بگڑ جائیں تو پورے گھر اور تمام معاشرہ کی امیدوں اور ارمانوں کا خون کر دیتے ہیں۔

آج کے دور میں اخلاق باختہ لٹریچر کا شمار ایسے عوامل میں ہے، جو بے راہ روی کو جنم دے رہے ہیں، تاہم موبائل فون اور انٹرنیٹ کی سہولیات آج کے دور میں جہاں ایک طرف بہترین رابطہ کا ذریعہ ہیں، تو دوسری طرف ان کے معاشرہ پر پڑنے والے مضر اثرات بھی نمایاں ہیں، عام تاثر یہی ہے کہ آج کی یہ جدید ٹکنالوجی ہماری نوجوان نسل کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا رہی ہے۔

سورۂ لقمان میں تربیت اولاد کے سلسلہ میں بہت ہی مؤثر انداز میں نصیحتیں ذکر کی گئی ہیں، جن میں بچوں کی ذہنی، فکری وخیالی معاشرتی وسماجی اور اصلاحی وتہذیبی تربیت میں شاندار دستور العمل ہیں اور والدین کے لیے اولاد کی تربیت کے معاملہ میں ان نصیحتوں کو اساس وبنیاد کا درجہ دیا گیا ہے، جن میں وحدانیت کے عقیدہ کو بچوں کے ذہنوں میں راسخ کرنا، اللہ کی ذات وصفات میں دوسروں کو شریک نہ کرنا، ماں باپ کیساتھ اچھا سلوک کرنا، اور ان کا احترام کرنا، ہر طرح کی چھوٹی بڑی برائی سے بچنے کی ان کو ترغیب دینا، ان کو نماز پڑھنے کی تاکید کرنا، اچھے اخلاق سے آراستہ کرنے کی تدابیر کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

اگر آج ہم مسلم معاشرہ پر نظر ڈالیں تو لوگوں کو ہر طرح کی برائیوں میں مبتلا پائیں گے، مکاری، جعل سازی، دھوکہ بازی، شراب نوشی جیسی مہلک بیماریوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، دراصل یہ بگاڑ اور فساد دل ودماغ کے فساد سے ہی پیدا ہوتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اس کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے، ألا ان فی ..... :ترجمہ: خبردار! انسان کی جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست اور ٹھیک رہتا ہے تو پورا جسم درست اور ٹھیک رہتا ہے اور وہ بگڑ جائے تو پورے جسم کا نظام ہی بگڑ جاتا ہے، اور سن لو وہ دل ہے۔

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ: درحقیقت دل ہی انسان کے افکار وخیالات کا سرچشمہ ہے، وہی صلاح وفساد، نیکی کا حکم دینے، اور بدی اور برائی سے روکنے اور محبت وعداوت کے اظہار کا مرکز ہے، اس کی طہارت کا خیال رکھنا اور اور اس کو اطمینان وسکون بہم پہونچانا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے: "أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ"۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان کے لیے جو چیزیں بھی پیدا کی گئی ہیں، وہ اپنے معمول کے مطابق مسخر ہیں، اور ہزاروں برسہابرس سے آگ میں جلانے کی، پانی میں بجھانے کی، اور غذا کو قوت پہونچانے کی، دوا کو شفا دینے کی صلاحیت جو اللہ تعالیٰ نے ان میں رکھی ہیں بحکم الٰہی اپنے اندر اثر رکھتی ہیں، اسی طرح انسان کے اچھے برے اعمال اور قوموں وافراد کے اخلاقی زندگی میں اثر رکھتے ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان اعمال واخلاق کا کیا گیا ہے، جیسا کہ ہم کو سابقہ قوموں کے قصوں سے معلوم ہوتا ہے۔

قوم ھود کا واقعہ ہو، یا قوم لوط کا، یا دیگر اقوام کے واقعات اور ان پر آنے والے عذاب کے اسباب، ان کے اعمال واخلاق کے فقدان اور گراوٹ کا نتیجہ ہی تھا، ان واقعات سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے کہ ہمارے اعمال واخلاق کا کیا طرز عمل ہے، آج ہم اپنے اعمال واخلاق کو بہتر بنانے کے لیے کتنے کوشاں اور فکرمند رہتے ہیں؟ اور ساتھ ہی اپنے اہل وعیال اور اپنی قوم وملت کے لیے کتنے فکرمند ہیں!

حوادث اور مسائل کا پیش آنا، اعمال اور اخلاق کے فساد سے وابستہ ہوتے ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے: "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ"۔

آج ہمارے اعمال واخلاق سے ہمارے دل اتنے سخت ہو چکے ہیں کہ ہمیں محسوس ہی نہیں ہوتا ہے کہ پیش آنے والے واقعات ہمارے اعمال کا نتیجہ ہیں جو ہم سے دن ورات صادر ہوتے ہیں، یا خدا کا عذاب۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اعمال واخلاق کو درست کریں، اور اعمال صالحہ کے داعی، سیئات کے منکر بنیں: "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ"۔

☆☆☆☆☆

عمل پیہم

# سرخ طوفانی ہوا کو دعوت دینے والی برائیاں

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی

اسلام کا یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ قیامت آکر رہے گی؛ البتہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم؛ حتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کے وقوع کے وقت کے بارے میں نہیں بتلایا گیا، یہی وجہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: قیامت کب آئے گی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: ما المسؤول عنها بأعلم من السائل. [صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۰] (سائل سے زیادہ مسؤول کو نہیں معلوم)؛ تاہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہت ساری علامتیں بتلائی ہیں، جن کو دیکھ کر ہر انسان اندازہ کرسکتا ہے۔

علامات قیامت میں سے ''برائیوں کی کثرت'' بھی ہے، وگرنہ کوئی زمانہ برائیوں سے خالی نہیں رہا ہے؛ حتی کہ جس زمانہ کے تعلق سے زبانِ نبوت نے ''خیر القرون'' قرار دیا ہے، اس زمانہ میں بھی برائیاں رہی ہیں اور یہ اللہ تعالی کا فیصلہ ہے؛ کیوں کہ یہ دنیا ''آزمائش کا گھر'' ہے اور ظاہر ہے کہ صرف خیر ہی خیر ہو، شر کا تصور نہ ہو تو پھر آزمائش کے کیا معنی؟ آزمائش تو وہاں ہوتی ہے، جہاں اسباب وذرائع موجود ہوں، پھر انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھتا ہے، پھسلتا نہیں ہے، تو کہا جائے گا کہ وہ آزمائش میں سرخرو ہوا۔

جب قیامت کی گھڑی قریب آئے گی تو معاشرہ میں برائیوں کی کثرت ہوجائے گی، ہر قدم پر برائیاں نظر آئیں گی، آپ نکلیں گے پھول تلاش کرنے اور آپ کا قدم خار پر پڑے گا، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں دامن کا تار تار ہونا کوئی بعید بات نہیں، اسی کو شاعر نے کہا ہے:

پھولوں کی تھی تلاش، ملے ہر قدم پہ خار
دیوانوں کا دامن ہوا جاتا ہے تار تار

زیر نظر مضمون میں قرب قیامت میں عام ہونے والی کچھ ایسی برائیوں کا تذکرہ ہے، جس کے تعلق سے عام حالت میں ہر انسان ''تھوتھو'' کرتا ہے، یہ برائیاں عام طور پر ایسی ہیں، جن کا تصور بھی معاشرہ میں محال ہے؛ لیکن قرب قیامت یہ ہوکر رہے گا، جس کے نتیجہ میں اللہ کا عذاب نازل ہوگا، آیئے! ہم ان برائیوں کو جانتے ہیں؛ تاکہ اپنے کو اور اپنے معاشرہ کو عذاب الٰہی سے بچاسکیں، ان برائیوں کا تذکرہ ترمذی کی ایک حدیث میں کیا گیا ہے، جو نمبروار یہ ہیں:

**۱- مال غنیمت کو دولت سمجھنا**

مال غنیمت وہ مال ہے، جو شرعی جہاد کے نتیجہ میں کفار کو شکست دے کر مجاہدین حاصل کریں، علامہ ابن عابدین ہندیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: الغنيمة: اسم لمايؤخذ من أموال الكفرة بقوة الغزاة وقهر الكفرة. [حاشیہ ابن عابدین: ج۴/ص۱۳۷] (غنیمت نام ہے کفار کے ان اموال کا، جو غازیانِ اسلام اپنے زورِ بازو سے ان سے لے لیں)، مال غنیمت کا مصرف کیا ہے؟ اس سلسلہ میں خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمادیا ہے: وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ [الأنفال:۴۱] (اور جان رکھو کہ جو چیز تم (کفار سے) لُوٹ کر لاؤ، اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اہلِ قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے، اگر تم اللہ پر اور اس (نصرت) پر ایمان رکھتے ہو، جو (حق وباطل میں) فرق کرنے کے دن (یعنی جنگ بدر میں)، جس دن دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوگئی، اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

اس آیت میں بتلادیا گیا ہے کہ مال غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے، خُمس (پانچواں حصہ) اللہ، اس کے رسول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار، یتامی، مساکین اور ابن سبیل (مسافر) کا ہوگا، بقیہ چار حصے جنگ میں شریک ہونے والے مجاہدین کے مابین تقسیم کیے جائیں گے، اللہ اور اس کے رسول کا جو حصہ (خمس) ہوگا، اسے پانچ مصارف میں خرچ کیا جائے گا: ۱- مسلمانوں کے عام مصالح پر، ۲- بنو ہاشم اور بنو مطلب میں سے آل بیت پر، ۳- یتامی پر، ۴- فقراء پر، ۵- اور مسافر پر۔

مال غنیمت کو اس طرح تقسیم کیا جانا شریعت کی رو سے ہے؛ لیکن جب قیامت کا وقت قریب ہوگا تو اس تقسیم سے صرف نظر کیا جائے گا، اسلامی لشکر میں جو طاقت اور ثروت والے ہوں گے،

اونچے عہدوں والے ہوں گے، وہ من مانی کریں گے، تمام حق داروں کو دینے کی بجائے اور مال غنیمت کی شرعی تقسیم کرنے کی بجائے صرف اپنے مصرف میں خرچ کریں گے، گویا ایک مشترکہ حق کو ذاتی دولت سمجھ بیٹھیں گے۔

مال غنیمت سے مراد اگرچہ ''خصوصی مال'' ہے؛ لیکن من جملہ اس سے جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے مال مشترک کو چند لوگ اپنے ذاتی مصرف میں استعمال کریں گے اور حق والوں کو محروم کریں گے، اس اعتبار سے موجودہ حالات میں ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے، امت میں کتنے افراد ایسے مل جائیں گے، جو مال مشترک کو ذاتی ملکیت سمجھ بیٹھے ہیں، اوقاف سے لے کر اداروں تک، ہر ایک اس میں ملوث ہے، ان کا استعمال ذات کے لیے ایسا ہوتا ہے، جیسے موروثی حق ہو؛ لیکن وہیں دوسری طرف جو حقیقی حق دار ہیں، وہ بے چارے محروم رہتے ہیں، جو افراد امت کے مال مشترک کے نگراں اور ذمہ دار ہیں، ان کو اس تعلق سے بہت زیادہ فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

**۲- امانت کو غنیمت سمجھنا**

امانت سے مراد یہاں وہ اشیاء ہیں، جو ایک محدود وقت کے لیے کسی کے پاس حفاظت کے لیے رکھوائی جاتی ہیں، پھر بعد میں وہ اشیاء مال والے کو واپس کرنا ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جس کو امین بنایا گیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنی امانت کو ادا کرے'' [البقرۃ: ۲۸۳]، جو شخص ان اشیاء کی حفاظت کرتا ہے، اسے ''امین'' کہا جاتا ہے، علامات قیامت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امانتوں میں خیانت کی جائے گی، جن کے پاس مال بطور حفاظت کے رکھوایا گیا ہے، وہ مال دینے سے انکار کردے گا، امانت کے مال میں وہ اس طرح تصرف کرے گا، جیسے اس کا اپنا مال ہو، جو اس نے دشمنان اسلام سے جنگ کرکے حاصل کیا ہے، یہی امت کے اجتماعی اموال کے نگراں کی بھی ہوگی، امت نے مال کی حفاظت کے لیے کسی کو ذمہ دار اور خازن بنایا ہوگا؛ لیکن وہ مصالح مسلمین میں ان اموال کو صرف کرنے کی بجائے ذاتی مصارف میں خرچ کرے گا، اور اس شان سے کرے گا گویا اس نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے حاصل کیا ہو۔

آج معاشرہ میں ایسے کئی طرح کے اموال پر غاصبانہ قبضہ کرلیا جاتا ہے، کمیٹی اور اداروں کے اموال پر کسی کو نگراں بنایا جاتا ہے، وہی نگراں کمیٹی کے کاموں اور اداروں کے امور میں اموال خرچ کرنے کی بجائے اپنے ذاتی مصرف میں خرچ کرتا ہے، جب ان سے کمیٹی اور اداروں کے کاموں کے لیے کہا جاتا ہے تو ڈھٹائی کے ساتھ کہتے ہیں کہ: ''خزانہ خالی ہے''؛ لیکن وہیں اپنے مصارف میں ان اموال کا استعمال دریغ کیا جاتا ہے، معاشرہ کے ایسے افراد کو، جو اس طرح کے کاموں میں ملوث ہیں، انھیں بہت زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! جان بوجھ کر اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو'' [الانفال: ۲۷]۔

**۳- زکوٰۃ کو تاوان سمجھنا**

زکوٰۃ اس مال کو کہا جاتا ہے، جو صاحبِ نصاب شخص سال گزرنے کے بعد اپنے مال کا چالیسواں حصہ نکالتا ہے اور معاشرہ کے ضرورت مندوں کو دیتا ہے؛ تاکہ وہ بھی اپنی ضروریات کو پوری کرسکیں، یہ اسلام کا دوسرا رکن ہے، جس کی ادائیگی کے بغیر اسلام میں باقی رہنا ممکن نہیں، یہ ہر شخص پر واجب بھی نہیں؛ بل کہ اس شخص پر واجب ہے، جس کے پاس قرض اور حاجت اصلیہ (بنیادی ضروریات زندگی کے سامان) سے زائد سونے، چاندی، نقدی، سامانِ تجارت اس مقدار میں ہو، کہ ان کی مالیت ساڑھے سات تولہ سونے (87.479grm) یا ساڑھے باون تولہ چاندی (612.360grm) کے برابر پہنچ جائے، یہ ایک عبادت ہے، جس کی ادائیگی ضروری ہے؛ لیکن قرب قیامت لوگ اس عبادت کی ادائیگی میں بھی کوتاہی کریں گے؛ بل کہ اس کو اپنے اوپر بوجھ سمجھیں گے۔

آج اگر ہم معاشرہ کا جائزہ لیں تو بہت سارے ایسے افراد مل جائیں گے، جو زکوٰۃ کو اپنے لیے بوجھ سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ وہی لوگ حکومت کے بھاری ٹیکسوں، انشورنس کے پریمیم، بینک کے لون انٹرسٹ؛ حتی کہ اپنے کسی کام کے لیے بھاری بھاری رشوتوں کی ادائیگی بھی ہشاش بشاش ہوکر کرتے ہیں؛ لیکن اسلام کے ایک اہم رکن کی ادائیگی میں وہ کوتاہی کرتے ہیں، اگر کسی کو دیتے بھی ہیں تو ایسے، جیسے اس نے اِس پر احسان کیا ہو، ایسے لوگوں کو بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے زکاۃ ادا نہ کرنے والوں کے لیے بہت سخت سزا رکھی ہے، ارشاد ہے: جس دن ان (جمع شدہ اموال) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا:) یہ ہے وہ (مال)، جو تم نے اپنے لیے جمع کرکے رکھا تھا، اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو'' [التوبۃ: ۳۵]۔

**۴- دین کی تعلیم کسی دوسرے مقصد سے حاصل کرنا**

اسلامی شریعت میں دینی علم کی بڑی اہمیت ہے اوراس کے حاصل کرنے والوں کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے؛ چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درجات بلند کرتا ہے، تم میں سے جولوگ ایمان لائے اور جن کو علم سے نوازا گیا'' [المجادلۃ:۱۱]، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو انبیاء کا وارث قرار دیا[صحیح ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۰۲۷] اور ایسے لوگوں کے لیے جنت کے راستے کو آسان قرار دیا ہے، ارشاد فرمایا: ''جو علم دین کی تلاش میں نکلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کردیتا ہے'' [صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۶۹۹]؛ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ علم دین کی جو کچھ بھی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں، وہ اس صورت میں ہے، جب کہ اسے اللہ کی رضا کے لیے حاصل کیا جائے، اگر اس کے حصول کا مقصد دین کمانا ہو، شہرت حاصل کرنا ہو تو پھر یہ فضیلتیں وعید میں بدل جاتی ہیں؛ چنانچہ ایک حدیث میں ہے: ''جس نے دنیا کمانے کی غرض سے ایسا علم حاصل کیا، جس سے اللہ کی رضا مقصود ہوتی ہے، تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو نہیں پائے گا'' [ابوداود، حدیث نمبر: ۳۶۶۴، ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۵۲، مسند احمد، حدیث نمبر: ۸۴۵۷]، ایک اور حدیث میں ہے: ''جس نے اللہ کی رضا کے علاوہ کے لئے علم حاصل کیا تو اسے اپنا ٹھکانہ جہنم بنالینا چاہیے'' [سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۵۵]، ایک حدیث میں کہ: ''جس نے علماء سے بحث ومباحثہ یا سفہاء (بے وقوفوں) سے مقابلہ، یا پھر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے علم حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل کردیں گے'' [سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۵۴]، ان تمام احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر علم دین کے حصول کا مقصد اللہ کی رضا کے علاوہ کچھ اور ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے سزا طے کر رکھی ہے۔

معاشرہ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ کتنے لوگ ایسے ہیں، جن کا مقصود اللہ کی رضا کی بجائے کچھ اور ہوتا ہے، کوئی مدرسی القاب سے ملقب ہونا چاہتا ہے، کوئی اپنا پوز بڑھانا چاہتا ہے، کوئی دنیا کمانا چاہتا ہے، اور کوئی کچھ تو کوئی کچھ، ایسے لوگوں کو بہت زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے۔

**۵- بیوی کی اطاعت کرنا**

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو یک گونہ عورتوں پر فضیلت بخشی ہے، ارشاد ہے: الرجال قوامون علی النساء. [النساء:۳۴] (مرد عورتوں پر قوام ہیں)، اس قوامیت کا سب سے بڑا لازمہ اور سب سے اہم تقاضہ یہ ہے کہ عورت مرد کی اطاعت کرے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں کسی کو یہ حکم دیتا کہ وہ کسی (غیر اللہ) کو سجدہ کرے تو میں یقیناً عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے'' [ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۱۴۰]، اس کی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے صاحب مظاہر حق لکھتے ہیں: ''مطلب یہ ہے کہ رب معبود کے علاوہ اور کسی کو سجدہ کرنا درست نہیں، اگر کسی غیر اللہ کو سجدہ کرنا درست ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے؛ کیوں کہ بیوی پر اس کے خاوند کے بہت زیادہ حقوق ہیں، جن کی ادائیگی کرنے سے وہ عاجز ہے، گویا اس ارشاد گرامی میں اس بات کی اہمیت وتاکید کو بیان کیا گیا ہے کہ بیوی پر اپنے شوہر کی اطاعت وفرماں برداری واجب ہے''۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ: ''جس عورت نے (اپنی پاکی کے دنوں میں پابندی کے ساتھ) پانچوں وقت کی نماز پڑھی، رمضان کے (ادا اور قضا) روزے رکھے، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی اور اپنے خاوند کی فرماں برداری کی تو (اس عورت کے لیے بشارت ہے کہ) وہ جس دروازہ سے چاہے، جنت میں داخل ہوجائے'' [صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۴۱۶۳]، ان احادیث وآیت سے معلوم ہوا کہ عورت پر بہرحال اپنے شوہر کی اطاعت لازم ہے، تمام ذخیرۂ احادیث اور آیات قرآنیہ میں اگر تلاش کیا ہے تو میاں بیوی کے تعلق سے دو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں: ۱- بیوی پر شوہر کی فرماں برداری ضروری ہے۔ ۲- اور شوہر پر ضروری ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آئے، یہی فطرت کا بھی تقاضا ہے، اب اگر کوئی مرد اپنی بیوی کی اطاعت کرنے لگے، وہ کہے تو اٹھے، وہ کہے تو بیٹھے، تو یہ معاشرتی لحاظ سے بھی غیر اخلاقی بات ہے اور فطرت کے تقاضے کے خلاف بات بھی ہے، معاشرہ میں ایسے مرد کو ''جورو کا غلام'' یا ''مریدزن'' کہا جاتا ہے۔

آج کئی مردوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ ''جورو کا غلام'' بنے بیٹھے ہیں، بیوی کی ہر بات پر آمنا وصدقنا کہتا ہے، بیوی کو ہی گھر کا حاکم ومالک بنا کر رکھا ہے، ایسوں کو بہت زیادہ سوچنے اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کہ ایسا عمل اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کا باعث ہوتا ہے۔

(جاری)

☆☆☆☆☆

ثبات واستقامت

# قضیۂ فلسطین اور اس کا اسلامی مزاج

محمد فرمان ندوی

قضیۂ فلسطین ایک سلگتا ہوا اہم اور بنیادی قضیہ ہے، جو عالمی سطح پر عوام وخواص کے قلب و نظر پر چھایا ہوا ہے، اس قضیہ کو اگر چہ بیسویں صدی عیسوی میں زیادہ وسعت حاصل ہوئی، لیکن اس کی تاریخ صدیوں پرانی اور اس کا سلسلہ دراز ہے، اس قضیہ کے اسلامی پہلو ومزاج ہی نے اس کو دوام عطا کیا ہے۔

کوئی بھی مزاج اور رجحان ہو، اس کے کچھ عناصر ترکیبی ہوتے ہیں، جن سے وہ مزاج تیار ہوتا ہے، وہی اس کے وجود کی بنیاد اور اساس ہوتے ہیں، جس طرح مادی اشیاء کے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی اشیاء کے بھی اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں، جن سے ان کا تانا بانا تیار ہوتا ہے، شخصیتوں اور افراد کے اجزاء ترکیبی سے تو ہم واقف ہیں، لیکن صفات اور خصوصیات کے اجزائے ترکیبی سے واقفیت ہم کو اصل سرچشمہ تک پہونچانے میں معاون ہوتی ہے، قضیہ فلسطین کے اسلامی مزاج کا سب سے پہلا عنصر مسجد اقصی کا وجود ہے، مسجد اقصیٰ وہ مسجد ہے، جس کو حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا، انہوں نے سب سے پہلے خانہ کعبہ کو بنایا اور اللہ کی بندگی اور عبادت سے اس کو آباد کیا، اس کے بعد مسجد اقصیٰ کو تعمیر کیا، اور دونوں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ تھا (صحیح بخاری بروایت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ)، صحیح روایات کے مطابق اس مسجد کی تولیت و نگرانی کی ذمہ داری حضرت ابراہیم اور اسحاق و یعقوب علیہم السلام نے نبھائی، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو پوری دنیا کی خلافت نصیب فرمائی تو یہ سرزمین بھی ان کے حصہ میں آئی اور انہوں نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر نو کی، حضرت زکریا اور یحی اور حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہم السلام کا بھی انتساب اسی مسجد کی طرف تھا۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کو سارے جہاں کو نبی بنایا اور رحمۃ للعالمین کے خطاب سے سرفراز فرمایا تو علانیہ طور پر مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کا سفر کرایا، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کا سفر اللہ کے تکوینی نظام کا حصہ، بلکہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کا جامع تھا، اور بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے گھرانے کو دنیا کی سعادتوں اور برکتوں کا کلید بردار بنایا تھا، اور ان کو ارض مقدس کی تولیت کا منصب عطا کیا تھا، جس کے حدود خدا نے خواب میں دکھائے تھے؛ لیکن اسی کے ساتھ تورات میں بار بار اعلان کر کے یہ بھی ان کو سنا دیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے خدا کے احکام کی اطاعت اور پیغمبروں کی تصدیق نہ کی تو یہ منصب ان سے چھین لیا جائے گا، حضرت ابراہیم کو اسماعیل و اسحاق دو بیٹے ہوئے تھے، اور ارض مقدس کو ان دونوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا، یعنی شام کا ملک حضرت اسحاق کو اور عرب کا ملک حضرت اسماعیل کو ملا تھا، شام میں بیت المقدس اور عرب میں کعبہ واقع تھا، حضرت اسحاق کے فرزندوں کو جن کا مشہور نام بنی اسرائیل ہے، بیت المقدس کی تولیت عطا ہوئی تھی، اور بنو اسماعیل کو کعبہ کا متولی بنایا گیا تھا، حضرت ابراہیم کی اولاد میں جس قدر پیغمبر ہوئے، ان میں سے بنو اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس اور اسماعیل کا کعبہ تھا، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر انبیاء عرب یا شام میں مبعوث ہوئے، وہ ان دونوں قبلوں میں سے کسی ایک کے متولی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمام دوسرے پیغمبروں کے متفرق اوصاف و خصوصیات کا جامع اور برزخ بنایا تھا، اسی طرح حضرت اسحاق و اسماعیل دونوں کی برکتوں اور سعادتوں کا گنجینہ بھی قرار دیا، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت جو صدیوں سے دو بیٹوں میں بٹتی چلی آئی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پھر ایک جگہ جمع ہو گئی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں قبلوں کی تولیت تفویض ہوئی، اور نبی القبلتین کا منصب عطا ہوا، یہی نکتہ تھا، جس کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ اور بیت المقدس دونوں طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اور اسی لیے معراج میں آپ کو مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد حرام (بیت المقدس) تک لے جایا گیا، اور مسجد اقصی میں تمام انبیاء کی صف میں امامت پر مامور کیا گیا، تاکہ آج اس مقدس دربار میں اس کا اعلان عام ہو جائے کہ دونوں قبلوں کی تولیت سرکار محمدی ﷺ کو عطا ہوتی ہے، اور نبی القبلتین نامزد ہوتے ہیں، اور قرآن مجید میں سورۂ اسراء کی ابتداء اور واقعہ معراج کا آغاز اسی حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے'' [سیرۃ النبی: ج۴/ص۲۴۷]۔

اس طرح مسلمانوں کا یروشلم اور مسجد اقصیٰ سے وہی تعلق ہے، جو مکہ مکرمہ اور مسجد حرام اور مسجد

نبویؐ سے ہے، غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے دو مرکزی مقامات مکہ مکرمہ اور یروشلم متعین کیے گئے، اور یہی ان کے روحانی وایمانی مراکز ہیں، جن سے ان کو روحانی غذا حاصل ہوتی ہے، مسجد اقصیٰ سے عیسائیوں کا تعلق کبھی بھی عبادت کا نہیں رہا، یہودیوں کا بھی اس سے مسلمانوں جیسا قلبی و اعتقادی تعلق نہیں رہا، یہ صرف مسلمان ہیں، جنہوں نے اس کو قلب و قالب سے چاہا اور اس کے لیے جان و مال کا نذرانہ پیش کیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد اقصیٰ سے اسلامی مزاج کی وابستگی کو مضبوط کرتے ہوئے فرمایا: لا تُشدُّ الرحال الا الی ثلاثة مساجد : المسجدالحرام والمسجد الأقصی ومسجد ی ھذا (سفر نہیں کیا جائے گا، مگر تین مساجد کی طرف: ایک مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی)۔ اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ! آپ ہمیں مسجد اقصیٰ کے بارے میں بتائیے: آپ نے فرمایا: وہ حشر ونشر کی جگہ ہے، وہاں جاؤ، اور اس میں نماز پڑھو، اور اس میں نماز کا ثواب دوسری جگہوں میں نماز کے مقابلہ میں ایک ہزار کے برابر ہے۔ حضرت میمونہؓ نے پوچھا: اگر وہاں نہ جاسکوں تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہاں کے لیے تیل بھیجو، جس سے چراغ جلایا جائے، جو ایسا کرے گا، وہ ایسا ہے کہ گویا وہ پہنچ گیا، یہی ایک نسبت ان کے اسلامی مزاج کی وضاحت کے لیے کافی ہے، چہ جائے کہ دوسرے ایسے دلائل وشواہد ہیں، جو اس حقیقت کو عالم آشکار کرتے ہیں۔

قضیہ فلسطین کے اسلامی مزاج کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سرزمین کا حقدار کون ہے؟ اس سوال کا جواب بھی اس کی طرف اشارہ کررہا ہے، سرزمین فلسطین پر دسیوں اقوام وملل نے حکومت کی، سامی عربوں کا زمانہ اولین اور طویل ترین زمانہ ہے، وہ لمبے عرصے سے یہاں مقیم ہیں اور انہیں کی اولاد سے یہ زمین چھینی گئی اور اس پر ایک ناجائز ملک کو بسایا گیا، اور مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت کم مدت قیام یہودیوں کی اس سرزمین پر رہی، اس زمانی رقبہ کے لحاظ سے بھی مسلمان اس سرزمین کے وارث ہیں، اور آخری دور میں بھی یہ زمین مسلمانوں کی ملکیت ہوگی ان شاء اللہ۔ کیونکہ صحیح مسلم کی روایت ہے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک مسلمانوں اور یہودیوں کی باہمی جنگ نہ ہوگی، مسلمان یہودیوں کو قتل کریں گے، یہاں تک درخت اور پتھر بھی گواہی دے گا کہ اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہے، تم اس کو قتل کرو [کتاب الفتن واشراط الساعۃ: ۲۹۲۲]۔

مسلمانوں کے اس سرزمین سے وابستہ ہونے، بلکہ اس کا حقدار ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہودی اپنا انتساب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں، اور اپنی نسل کے دیگر انبیاء کو اپنا مقتدا وپیشوا مانتے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قربانیوں کے نتیجہ میں قائد ورہنما بنایا، اس وقت ابراہیم علیہ السلام نے ایک درخواست کی تھی کہ میری پوری نسل کو یہ شرف عطا ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لا ینال عھدی الظالمین (ظالموں کو یہ انعام نہیں ملے گا)، انسانی تاریخ شاہد ہے کہ یہودیوں نے ہر زمانہ میں ظلم وبربریت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ سفاکیت اور خونریزی میں اپنا کوئی ثانی نہیں تھے، اپنے محسنوں کے احسان کو نہ ماننا، بلکہ ان کے قتل کے درپہ ہونا ان کا عام مزاج رہا ہے، انہوں نے اللہ کے قانون 'یوم السبت' کی مخالفت کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایذاء پہونچایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور سولی دینے کی سازش کی، حضرت مریم پر گھناؤنا الزام لگایا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں ان کو سزا دی اور ان کو سور اور بندر بنادیا، ایسے جرائم کے مرتکب ہونے کے بعد بھی یہ دعوی کہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں، کیسی بے جوڑ بات ہے، اور یہ کہ ہم ہی ارض مقدس کے حقدار ہیں، کیسی بے بنیاد منطق ہے، ان جرائم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب امامت وخلافت سے ہٹایا اور ان کی جگہ پر امت محمدیہ کو فائز کیا، اس لیے یہ علاقہ بھی مسلمانوں کا ہے اور اسلامی مزاج ہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

اسلامی مزاج کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ۱۶ھ میں بیت المقدس فتح کیا جاتا ہے، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فلسطین کا سفر کرتے ہیں، اور یہ اسلامی فتح کمانڈر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت وامارت میں پایہ تکمیل کو پہونچتی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ربیع الاول ۱۶ھ میں اپنے ایک غلام کے ساتھ ایک سواری پر جابیہ پہونچتے ہیں، وہاں ان کا استقبال حضرت ابوعبیدہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کرتے ہیں، اور مسلمانوں اور عیسائیوں میں معاہدہ طے ہوتا ہے اور چابی حوالہ کی جاتی ہے، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں ایک خطبہ دیتے ہیں، ان کے الفاظ ہیں: یا أھل ایلیاء ! لکم ما لنا وعلیکم ما علینا، پھر عیسائی پوپ

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بعض آثار دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اور اس کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جاتے ہیں، اسی درمیان نماز کا وقت ہوتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے نماز کی جگہ دریافت کرتے ہیں، وہ وہیں کلیسا میں نماز پڑھنے کا مشورہ دیتا ہے؛ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس فتح و نصرت کے ماحول میں بھی کلیسا میں نماز پڑھنے سے انکار کرتے ہیں، اور وہاں سے ذرا فاصلہ پر نماز پڑھتے ہیں، اس طرح مسلمان اس سرزمین میں اپنے شعائر اور شناخت کے ساتھ رہتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فتح بیت المقدس کے بعد یہ پورا علاقہ اسلامی قلمرو میں اسلامی مزاج و منہاج کے ساتھ رہا، مسلمان اس میں عبادت کررہے تھے، اور اس کی زیارت کے ذریعہ اپنے ذخیرۂ آخرت میں اضافہ کررہے تھے، بالآخر ۴۹۲ء میں صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا، اور وہ قبضہ ایک دو سال نہیں، بلکہ نوے سال تک رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے سلطان عماد الدین زنگی، سلطان نور الدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کو بیت المقدس کی آزادی و بازیابی کے لیے کھڑا کیا، جنہوں نے سب سے پہلے متفرق اور منتشر حکومتوں کو متحد کیا، پھر متحدہ محاذ بنایا، اور اس علاقہ کو عیسائی تسلط سے آزاد کرایا، اور یہ آزادی تاریخ اسلامی کی ایسی پہچان بن گئی کہ مشہور مؤرخ خیر الدین زرکلی نے کہا:

هاتی صلاح الدین ثانیة فینا
جددی حطین أو شبه حطینا

عثمانی خلافت کے آخری دور میں یہودیوں نے سلطان عبد الحمید ثانی سے فلسطین میں بسنے اور وہاں کی زمین کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی تو عثمانی خلیفہ نے دوٹوک کہا کہ فلسطین کی سرزمین پر یہودیوں کا ناپاک وجود بالکل برداشت نہیں کیا جا سکتا، اگر ایسی کسی خواہش کا اظہار کیا گیا تو اس کا انجام کشت وخون کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ سلطان عبد الحمید کا یہ جملہ ان کے اسلامی مزاج کا ترجمان تھا، جو نسل در نسل ان میں منتقل ہوتا رہا، لیکن یہودیوں کے سازشی مزاج نے پہلے تھیوڈر ہرٹزل کی قیادت میں سوئزر لینڈ میں ۱۸۹۷ء میں ایک یہودی ریاست کے قیام کا منصوبہ بنایا، اور پھر اس کے لیے خفیہ میٹنگ اور پلاننگ شروع کردی، ترکی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں بڑی چالاکی اور عیاری دکھائی، عربوں کو ترکوں کے خلاف اکسایا، اور بغاوت پر آمادہ کیا، چنانچہ متحدہ ممالک تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرے، بالآخر ۱۹۲۴ء میں ترکی خلافت کا الغاء ہوگیا، اور بقول سعدی شیرازی:

آسمان را حق بود گر خوں بگیرد بر زمین
بر زوال ملک مستعصم امیر المؤمنین

(اگر آسمان امیر المؤمنین مستعصم کی بادشاہت کے زوال پر زمین پر خون برسائے تو یہ اس کے لیے روا ہے)۔

یہی حال پورے عالم اسلام کا رہا، اور یہ نہیں معلوم کہ کب تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد ترکی کے زیر اثر ممالک برطانوی نگرانی میں منتقل ہوگئے، اور برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کے بسانے کا سلسلہ شروع کیا، چند سالوں میں ان کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی پھر ناگاہ وہ دن بھی آیا، جس میں اسرائیلی حکومت کے قیام کا اعلان کردیا گیا، اور ۱۹۴۸ء کا سال تھا، جب عالم اسلام کے قلب میں یہ ناجائز تسلط قائم ہوا، یہ تسلط وحشیانہ قتل کے بعد وجود میں آیا، متعدد فلسطینی دیہاتوں اور بستیوں کو خالی کرایا گیا، اور یہاں کی آبادی مجبوراً ہجرت کرنے اور پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوئی، اس واقعہ کو نکبہ کا نام دیا گیا۔

یہ واقعہ ایسا حوصلہ شکن اور مایوس کن تھا کہ عالم اسلام کے مسلمان بالعموم اور فلسطین کے باشندے بالخصوص ہمت کھو بیٹھتے، لیکن یہ دینی وایمانی تربیت تھی، اور اسلامی مزاج تھا کہ شوق شہادت کا جذبہ ہر خاص و عام میں پیدا ہوا، اور ہر شخص کی زبان پر یہ جذبہ تھا:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
کہ افضل سے افضل عبادت نصیب

اور نوجوانوں اور بچوں نے ان اشعار کے ذریعہ اپنے ماں باپ کو اس طرح رخصت کیا:

أماه انی ذاهب فلتفرحی
بعد المنية جنة الرحمن

(اے میری ماں! میں موت کے بعد جنت کی طرف جارہا ہوں، تو تم غم نہ کرو، خوش ہوجاؤ)۔

۱۹۴۸ء نکبہ کے بعد کفر قاسم کا سانحہ، خان یونس کا قتل عام، صابرہ اور شتیلا کا قتل عام، ابراہیمی مسجد کا قتل عام، دیر یسین کا قتل عام، بیت لحم کا قتل عام، یہ اور دیگر واقعات ایسے ہیں کہ انسانی قوی کمزور پڑ جائیں، اعصاب ڈھیلے ہو جائیں؛ لیکن اسلام اور ایمان کی فطرت میں کمزوری اور شکست خوردگی کا کوئی وجود نہیں، اس لیے یہ قضیہ ہمیشہ زندہ وتابندہ رہا اور خون مسلم میں حرارت اور حرکت پیدا کرتا رہا۔

اس قضیہ میں نیا موڑ اس وقت آیا، جب شیخ احمد یسین نے حرکة المقاومة الاسلامية (حماس) کی بنیاد رکھی، یہ تحریک اس قضیہ کے لیے نیا خون ثابت ہوئی، جس نے انجام کی پرواہ کیے بغیر بیت المقدس کی آزادی کا بگل بجایا، اور دور یاستی حل کو مسترد کردیا، اور مکمل فلسطین کی

آزادی کا اعلان کیا، اس کی نمایاں شخصیات میں عبدالعزیز رنتیسی اور محمود الزھار ہیں، اس کی عسکری ونگ کتائب عزالدین القسام کا دینی واسلامی مزاج ہے کہ اس نے ۷/ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو طوفان الأقصی کا آغاز کیا، جس نے ناقابل تسخیر طاقت کے پرانچے اڑادیئے، اور دشمن کو ذلت و پسپائی کا سامنا کرنا پڑا، اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

طوفان الأقصی کا عقلی وایمانی جواز کل بھی تھا اور آج بھی ہے، بعض ناتجربہ کار افراد نے اس کو خودکشی اور ناعاقبت پر مبنی اقدام سے تعبیر کیا، جب کہ ان کا یہ کہنا خود کم علمی پر مبنی ہے، اسرائیل اپنے زمانہ قیام ہی سے فلسطینیوں کے لیے ایک ناسور بنا ہوا ہے، کتنی جانوں کا اتلاف اس نے کیا، اور کتنی املاک کو برباد کیا، اور وہاں کے باشندوں پر کتنے مظالم اس نے ڈھائے اور کتنے بچوں کو یتیم کیا اور عورتوں کو بیوہ کیا، کیا ایسے ناعاقبت اندیشوں کو نہیں معلوم کہ اس عرصہ میں فلسطینیوں پر ظلم وستم کے بڑے بڑے واقعات تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں، نکبہ سے لے کر طوفان الأقصی تک اسرائیل کے ظلم کی طویل داستان ہے، ہزاروں فلسطینی نوجوان اسرائیلی جیلوں میں بند ہیں، خواتین اور بچے بھی پس زنداں ہیں، کون ہے جو ان کی دادرسی کرے، جب کہ قرآن کریم کا اعلان ہے: وَمَالَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اور کیا بات ہے کہ اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے)۔

طوفان الأقصی کے جواز کی ایک عقلی وایمان دلیل یہ بھی ہے کہ قضیہ فلسطین ایک عالمی قضیہ ہے، کوئی ملکی، علاقائی اور قضیہ نہیں ہے، بعض لوگوں نے اس کو جزئی اور ذیلی قضیہ کے طور پر متعارف کرایا، اور عالم اسلام کی عظیم شخصیات نے اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا، اور اس کو ایمان و عقیدہ کا جزء بتایا، اور اس کے انحراف اور پہلوتہی کرنے کو ایمان میں کمی اور اسلام سے انحراف گردانا۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بے شمار خطابات ومقالات میں اس قضیہ کے ایمانی واسلامی مزاج کو اجاگر کیا ہے، انہوں نے اس موضوع پر عالم اسلام کے سامنے ایک کتاب پیش کی، جس کا نام ہے: المسلمون و قضية فلسطين، اس میں دس مقالات ہیں، ہر مقالہ اسی ایمانی واسلامی روح کا ترجمان ہے، انہوں نے قضیۂ فلسطین کے بنیادی عوامل ومحرکات شمار کراتے ہوئے ایمانی جذبہ کی کمزوری کو اس کا بنیادی سبب قرار دیا ہے، اور ذکر کیا ہے کہ جب اس جذبہ پر عقل کی حکمرانی ہوتی ہے اور اقدام سے پیچھے ہٹنے کا مزاج عام ہوجاتا ہے تو زوال و ادبار قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔

دوسری شخصیت علامہ یوسف القرضاوی کی ہے، جن پر یہ قضیہ پورے طور پر چھایا رہا، اور انہوں نے اس کی علمی وفکری قیادت بھی کی، سیکڑوں خطابات کے ذریعہ قوم مسلم کے دلوں کو گرمایا، اور ان میں ایمانی روح پیدا کی، انہوں نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام ہے: فلسطين قضية كل مسلم، اس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ یہودیوں سے ہماری کوئی نسلی دشمنی نہیں، ان سے دشمنی کی وجہ ان کا سامی النسل ہونا نہیں، کیونکہ عرب کی بھی نسبت حضرت نوح کی طرف ہے، اور ان کا بھی انتساب حضرت ابراہیم کی طرف ہے، قضیہ کی بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے فلسطینی عربوں، بلکہ عالم اسلام کے قبلہ ومرکز کی زمین زبردستی غصب کی، وہاں کے باشندوں کو بے گھر کیا، اور ان کے گھروں کو تباہ کیا اور مسلسل یہ کررہے ہیں، یہی وہ بنیادی وجہ ہے، مزید یہ کہ یہ علاقہ مسلمانوں کے قبلہ رہا ہے، اسراء ومعراج کا واقعہ بھی اسی سے وابستہ ہے، اور یہودیوں کی کبھی بھی یہ مرکزی جگہ نہیں رہی، ہرٹزل نے جب یہودی مملکت کا نقشہ پیش کیا تو فلسطین کبھی بھی اس کی اولین ترجیح نہیں رہا، افریقہ اور شمالی امریکہ میں یہودی اسٹیٹ بنانے کی بات آئی تھی، بلکہ ہرٹزل نے موزمبیق اور بلجیکا، ارجنٹائن، قبرص، یوگنڈا میں یہودی ریاست کی بات کہی تھی، اور اس کے لیے زمین کی حصول یابی کی کوششیں بھی وہیں شروع کردی، پھر علامہ قرضاوی نے تاریخی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہودی دنیا کے لیے خطرہ ہیں، اس طرح پانچ فصلوں پر مشتمل یہ کتاب قضیہ فلسطین کے اسلامی مزاج کو سمجھنے میں ایک رہنما کتاب ہے۔

طوفان الأقصی تو خالص روح جہاد پر مبنی ایک اقدام تھا، جس کا شعار ان کے ترجمان ابوعبیدہ کے اس جملہ سے ظاہر ہے: انه جهاد: نصر أو استشهاد (یہ جہاد ہے، فتح ہوگی یا شہادت)، اس جملہ نے بہت سے خواب غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو جگادیا، اور ان کے اندر ایمانی اسپرٹ پیدا کردی، اس تناظر میں قضیہ فلسطین کا مزاج ایمانی، اسلامی، دینی، قرآنی اور ربانی ہے، اس مزاج کی استقامت سے ایسے محیر العقول واقعات رونما ہوئے، جو دنیائے انسانیت کے لیے روشنی کا مینار ہیں، اس کے ذریعہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا، غیروں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا، بلکہ اسلام کے مطالعہ کی لہر پیدا ہوئی اور بہت سے افراد اور جماعتوں نے اسلام قبول کیا: "وَلِلّٰهِ الأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ، وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاءُ".

☆☆☆☆☆

احوالِ عالم

# اسلام کی سربلندی اور مہذب دنیا

محمد اعظم ندوی

نام نہاد عالمی طاقتوں نے اسلام اور اسلام سے منسوب ہر اس شے کی مخالفت کا بیڑا اٹھا رکھا ہے جو اسلام کی قوت وشوکت کا اعلان کرتی ہو، اور جس کے ذریعہ اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہو، حرکت ونمو سے لبریز متحرک اور فعال اسلام کسی کو پسند نہیں، ٹھہرا ہوا، جامد وساکت، تھکا ہوا اور اونگھتا ہوا اسلام جو فکر وعمل سے خالی ہو، اور جو آسانی سے کسی تہذیب میں ضم یا گم ہوجانا گوارا کرلیتا ہو، یا اپنے مظلوموں کا سودا کرلینے پر راضی ہو، سب کو پسند ہے، اسلام اپنی امتیازی خصوصیات، جماعتی قوت، تحریکی مزاج، قیادت اور مرکزیت کے ساتھ آنکھوں میں چبھتا ہے، مسلم ممالک کے نمائندوں کو عالمی اسٹیج پر خالص اسلام کی بات کرنے کی اجازت نہیں، گھلا ملا اسلام، صلح کل والا اسلام، مصلحت پرست اسلام، ڈرا سہما ہوا اسلام، جو حقیقت میں اسلام ہے ہی نہیں کچھ اور ہے، پیش کیا جائے تو کہیں کوئی رکاوٹ نہیں، ورنہ گرفت ہی گرفت ہے۔

جب کہ غور کریں تو ہر ایک کو اپنے امتیازات عزیز ہیں، کیتھولک عیسائیوں کی ایک مخصوص اور آزاد ریاست ہے جس کو ''واٹیکن سٹی'' کہا جاتا ہے، جو اٹلی کے شہر روم میں واقع ایک خود مختار ریاست ہے، اس کے سفارتخانے ہیں، اسے مختلف ممالک میں سفارتی نمائندگی حاصل ہے، اور اس کا ایک ایسا صدر ہے جسے ملکی صدارت کے ساتھ ساتھ دنیا کے بیشتر ممالک اور براعظموں میں روحانی قیادت بھی حاصل ہے، امریکہ کے سربراہان عیسائیت کو اپنی گفتگو سے خارج نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے اقدامات میں ہمیشہ واضح طور پر تحریف شدہ عیسائی مذہب کی تعلیمات کا عکس نظر آتا ہے، ان کی جنگیں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، آٹھ سے زیادہ چھوٹی بڑی صلیبی جنگیں اسی نام سے لڑی گئیں، ابھی بھی گاہے گاہے اس کا حوالہ آہی جاتا ہے، اور اسی جذبہ سے اسرائیل نوازی جاری ہے، بھارت پر ایک برہمن طاقت کا راج ہے جو اپنے تمام تر پروگراموں میں- غلط یا صحیح - مذہبی وابستگی کا اظہار کرتی ہے، صہیونیوں نے واضح الفاظ میں اور اعلانیہ طور پر مقبوضہ فلسطین (اسرائیل) کے لیے یہودیت کو سرکاری مذہب کے طور پر اپنا رکھا ہے، سب کچھ ٹھیک ہے، بس اسلام کو ایک سیکولر شبیہ کا لبادہ اڑھے رہنا ہے، لیکن بقول اقبال:

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر!

اس پس منظر کو نظر میں رکھیں تو مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کا معاملہ ایک افسانہ اور جھوٹ کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا، جو صرف اسلام کی بات آنے پر بحث کا موضوع بن جاتا ہے، آخر مغرب کو اسلام سے کیا کد ہے؟ اور خاص طور پر اس اسلام کے ساتھ کیا مسئلہ ہے جسے وہ ''سیاسی اسلام'' کہتے ہیں؟ مغربی ممالک کو اسلام سے دشمنی صرف اس لیے ہے کہ یہ ایک آفاقی اور جامع پیغام ہے، اسلام جغرافیائی طور پر بھی کسی جزیرہ میں بند نہیں، جیسے ہندومت اور بودھ مذہب، وہ منتخب لوگوں کے ساتھ خاص نہیں جیسے یہودیت، عیسائیت عالمگیریت میں اسلام کی ہمسری کرتی ہے؛ لیکن اپنی تعلیمات کے تنوع اور زمان ومکان کے اعتبار سے ہمہ جہت ہونے اور قابل عمل ہونے میں وہ اسلام سے پیچھے رہ جاتی ہے۔

صرف اس لیے اسلام آنکھوں میں نہیں چبھتا کہ وہ اپنے پیروکاروں کی مکمل رہبری کا فریضہ انجام دیتا ہے، وہ ان کی زندگی میں پوری طرح داخل بلکہ اس پر حاوی ہے، وہ ان کی روزمرہ کی سرگرمیوں حتی کہ ان کے خورد ونوش اور لباس و پوشاک سے متعلق اصول وضوابط متعین کرتا ہے، وہ ان کو ان کے کسب مال کے حلال ذرائع اور اخراجات کے تعلق سے بھی ہدایات دیتا ہے، غرض کہ اسلام اپنے نام لیواؤں کی تمام سرگرمیوں پر نگراں اور حاکم کی حیثیت رکھتا ہے، اسلام آسمان و زمین، روحانی ضرورت اور مادی ضرورت، انسان اور مالک حقیقی کے مابین ایک ہم آہنگ رشتہ استوار کرنے والا انقلابی اور جامع تصور ہے۔

مغرب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے دیار میں سفید نسل کی بالادستی کا خواب دیکھتا ہے، بلکہ اسے استعمار اس سے بھی زیادہ عزیز ہے جس کے ذریعہ وہ خود کو دنیا کا استاد، سرپرست، اتالیق اور حاکم تصور کرتا ہے، اور اپنی ایسی ہی اعلیٰ درجہ کی حیثیت تسلیم کرانا چاہتا ہے، تو پھر وہ کس طرح برداشت کرے گا کہ وہ لوگ جن کو وہ خود سے کمتر سمجھتا ہے، کھڑے ہوں، اور ایسی ثقافت وتہذیب

کو عام کریں جو اپنے اندر حیرت انگیز اثر پذیری کی صلاحیت رکھتا ہو، اور جس کا سکہ تھوڑی سی محنت سے سکۂ رائج الوقت بن جاتا ہو، اور جس کے چراغ کی روشنی میں سچ کے چراغ روشن ہوتے ہوں، اور جھوٹ کی امیدوں پر اوس پڑ جاتی ہو؟

اسلام پسندی مغربی سیاستدانوں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب ہے؛ اسی لیے مغربی ممالک نے ایشیا اور افریقہ کے مسلم اور غیر مسلم ممالک پر ناجائز قبضہ کیا تھا، اور غلبہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے جو سب سے پہلا اور اپنے نزدیک اہم کام کیا تھا، وہ یہ کہ مغربی ثقافت وتہذیب کو پوری طرح عام کردیا جائے، اور مغربی ثقافت کو عام کرنے کا پہلا زینہ یہ تھا کہ انہوں نے مشرقی یعنی اسلامی ثقافت، اس کے ماننے والوں کی زبانوں، ان کی ترجیحات، ان کی عادتوں، ان کی پسند وناپسند اور ان کے پورے تاریخی ورثے کی تحقیر وتذلیل اور ان کو بے حیثیت قرار دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا، اور آج بدستور یہ عمل جاری ہے۔

لیکن یہ بات خوش آئند ہے کہ آج مغرب نے اپنے ہی گھر میں اسلام کے تہذیبی غلبہ کا ادراک کرنا شروع کردیا ہے، مسلمان مغربی ممالک میں اپنی جگہ بنا رہے ہیں، خواہ وہ شہریت اختیار کرنے والے ہوں، یا وہاں مقیم تارکین وطن، یا وہ یورپی باشندے جو دامن اسلام سے وابستہ ہورہے ہیں، سب کا اس میں حصہ ہے، وہ ایک عددی طاقت بن چکے ہیں، اور اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں، مغرب میں مسلمان اب پہلے کی طرح عارضی مدت کے لیے صرف کسی پیشہ سے وابستہ ہوکر، یا مزدور اور طالب علم کی حیثیت سے نہیں رہتے بلکہ وہ مختلف میدانوں کے باصلاحیت ماہرین، سائنٹفک اور اکیڈمک دنیا میں اہمیت کے حامل افراد کی حیثیت سے رہتے ہیں، اور ان میں سے بہت سے مسلمان مذہب کے پوری طرح پابند ہیں، افتخار کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور اپنے مغربی معاشرے میں مؤثر حیثیت کے حامل ہیں، وہ اپنے مغربی معاشروں میں خلوص کے ساتھ خدمات مہیا کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ ہم آہنگ ہیں، ان کے مسلمان ہونے اور مغربی شہری ہونے کے مابین کوئی تضاد نہیں پایا جاتا ہے۔

یہی بات مغربی سیاست دانوں کو ہضم نہیں ہوتی، اور ان کے لیے مستقل دردسر ہے؛ کیوں کہ اسلام ایک عقیدہ کے اعتبار سے یورپ میں سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن گیا ہے، واشنگٹن میں واقع پیو ریسرچ سینٹر نے کئی سال پہلے ہی یہ تحقیق پیش کی تھی کہ اگلی چار دہائیوں میں عیسائی مذہب سب سے بڑا مذہبی گروہ بنا رہے گا؛ لیکن کسی بھی مذہب کے مقابلہ اسلام سب سے تیز رفتاری سے آگے بڑھے گا، واضح رہے کہ اس وقت دنیا میں عیسائیت سب سے بڑا مذہب ہے، اس کے بعد مسلمان آتے ہیں، اگر موجودہ رجحان برقرار رہا تو ۲۰۶۰ء تک اسلام سب سے بڑا مذہب بن جائے گا، اندازہ ہے کہ اگلے چار عشروں میں دنیا کی آبادی ۹ء۱۳ ارب تک پہنچ جائے گی اور مسلمانوں کی آبادی میں ۷۳ فیصد کا اضافہ ہوگا، جب کہ عیسائیوں کی آبادی ۳۵ فیصد بڑھے گی اور ہندوؤں کی تعداد میں ۳۴ فیصد اضافہ ہوگا۔

مغربی ممالک میں مغربی مسلمانوں کے اثرات بھی دن بدن بڑھتے جارہے ہیں، یورپ میں اس ثقافتی تبدیلی کی صرف ایک ہی مثال کافی ہے، اور وہ ہے حلال کھانوں کی تلاش، جب یورپ نے افریقہ پر دائیں ہاتھ میں ہتھیار اور بائیں ہاتھ میں بائبل لے کر قبضہ کیا، غیر مسلم قبائل اپنے گھروں میں فطری طریقہ سے تیار کردہ شراب ہی پیتے تھے؛ لیکن جب عیسائی مغرب آئے تو افریقہ میں شراب کی فیکٹریاں قائم کیں، اور افریقیوں کو ان فیکٹریوں سے الکحل خریدنے پر مجبور کرنے کے لیے گھروں پر روایتی طریقوں سے شراب کی تیاری پر پابندی عائد کرنے والے قوانین جاری کیے، اور اب تک ایسے قوانین بہت سے افریقی ممالک میں نافذ العمل ہیں، مغرب غیر مسلم معاشروں میں اپنی شراب کو فروغ دینے میں اس حد تک کامیاب ہوچکا ہے جتنا کہ چین میں افیون کی تجارت کو فروغ دینے میں اس کو کامیابی ملی تھی، جب کہ مسلم معاشروں میں شراب کو فروغ دینے میں اس کی کامیابی بہت ہی محدود ہے۔

جب مسلمان آج مغربی ممالک میں آکر اور اہل مغرب کے درمیان رہ کر ایک ایسی نئی ثقافت تشکیل دیں جو حلال کھانے شراب، اور خنزیر کے گوشت سے پاک وصاف ہو، اور اس کا مطالبہ دن بہ دن غیر مسلموں کی جانب سے بھی بڑھتا جارہا ہو، تو یہ خود اپنے آپ میں ایک ثقافتی اور معاشی انقلاب ہے، اور یوروپی ثقافت میں غیر معمولی دخل ہے، اور اس کا ایک ہی راستہ ہے جو مسلمانوں کی طرف سے ہوکر آتا ہے۔

یہ بات ثقافتی اور معاشی تسلط کی سربراہی کرنے والے مغربی سیاستدانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ آپ بحیثیت مسلمان کسی طرح ان کے ہاتھ نہ آئیں، ان کے قابو سے باہر نکلنے کی کوشش کریں، صارف سے صنعت کار بن جائیں، پیروکار سے پیشوا بن جائیں، مقلد سے امام بن جائیں، مغربی رہنماؤں کے لیے یہ

ناقابل برداشت ہے کہ آپ ایک خودمختار انسان بن جائیں جسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد، اپنی مذہبی شناخت اور اپنی روایات پر فخر ہو اور اپنے اسلام پر ناز ہو، اسلام سے مغرب کو یہی مسئلہ ہے، ایک ایسے عالمگیر اور ہمہ گیر دین حق کے ساتھ مسئلہ ہے جس کے نام لیواؤں کو اس کی تعلیمات سے بالکلیہ الگ کرنا محال ہو، جب کہ مغرب تسلط، تکبر، کمزوروں کے استحصال اور طاقت کے بے جا استعمال کے نشہ میں دھت ہو:

باطل کے فال وفر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زِرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

مغربی حکام کو جو چیز سب سے زیادہ بے چین کرتی ہے اور بے خوابی میں مبتلا کرتی ہے وہ ہمارا مکمل اسلام ہے، ایسا ہوتا رہا ہے، قرآن کریم نے اسے بیان کیا ہے: "وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ" [بروج:۸] (وہ مسلمانوں سے اسی بات کا بدلہ لے رہے تھے کہ وہ اس خدا پر ایمان رکھتے تھے جو غالب اور بڑی خوبیوں والے ہیں) دوسری جگہ ارشاد ہے: "قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّا اِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنزِلَ اِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلُ، اَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُوْنَ" [مائدہ:۵۹] (آپ کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! کیا تم ہم سے اسی لیے عناد رکھتے ہو کہ ہم اللہ پر، اس کتاب پر جو ہم پر اتاری گئی، اور اس کتاب پر جو ہم سے پہلے اتاری گئی، ایمان رکھتے ہیں، اور یقیناً تم میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں)۔

یہی صورت حال آج بھی قائم ہے کہ اسلام حیرت انگیز تیزی سے پھیل رہا ہے، خود اہل مغرب کے زیادہ تر مطالعات اور تحقیقات جیسا کہ ذکر کیا گیا، اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اسلام بہت سارے یورپی ممالک میں وہاں کا پہلا مذہب بن جائے گا، اس حقیقت کے باوجود کہ اسلام اور مسلمانوں سے کھلی عداوت کی تحریکی کوششیں پاگل پن کی سطح تک پہنچ چکی ہیں، پھر ہم جانتے ہیں کہ زیادہ تر مسلمان صحیح طریقے سے اسلام کی پاسداری نہیں کرتے اور اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام نہیں دے رہے ہیں، اس کے احکام کو صحیح طور پر اپنی زندگی میں داخل نہیں کرتے، نیز مسلمانوں اور مسلم ممالک کے حالات لوگوں کو اسلام کی طرف راغب نہیں کرتے، اس کے باوجود یہ مثبت تبدیلیاں دیکھنے میں آرہی ہیں۔

اگر مسلمان واقعتاً اپنے مذہب کی نمائندگی کریں، اپنی دعوت کو عام کریں، اور ان کے سیاسی حالات بہتر ہوں تو لامحالہ، آپ دنیا میں لوگوں کو خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہوئے دیکھیں گے، اور یہ پیشین گوئی سچی ہوگی جس کا ذکر اس حدیث میں ہے کہ: "ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق ازواج مطہرات کے گھروں سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو حضرت فاطمہؓ نے اپنے گھر کے دروازے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا، اپنا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک پر رکھا، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے کپڑے بوسیدہ ہوگئے ہیں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے تمہارے والد کو ایسا دین دے کر بھیجا ہے جس کو اللہ تعالیٰ روئے زمین کے ہر پکے اور کچے گھر میں ضرور داخل کریں گے، اور دنیا کے جتنے حصہ میں رات پہنچتی ہے اتنے حصے میں یہ دین بھی پہنچے گا یعنی ساری دنیا میں پہنچ کر رہے گا" [المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر:۵۹۶]۔

اور سب سے سچی بات یہ ہے کہ "وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلَى أَمْرِهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ" [یوسف:۲۱] (اور اللہ تعالیٰ اپنے کام پر قادر ہیں؛ لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں)۔

☆☆☆☆☆

## تکبر سے بچنے ایک چٹکلہ

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ فرمایا کرتے تھے کہ: میاں! یہ تکبر بڑی خراب چیز ہے، بڑے بڑے معالجوں کو چکر دیدیتی ہے، اس کا علاج کرنا آسان کام نہیں ہے؛ لیکن میں تمہیں ایک چٹکلہ بتا رہا ہوں، اس چٹکلے پر عمل کرلو تو ان شاء اللہ پھر اس تکبر کی بیماری میں مبتلا ہی نہیں ہوگے اور اگر ہوگئے تو ان شاء اللہ جلدی نکل جاؤ گے، وہ چٹکلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، ہر وقت، ہر لمحے، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کے شکر کی رٹ لگاؤ، موسم اچھا ہے: اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔ ہوا چل رہی ہے: اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔ جو اچھی بات سامنے آئے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جتنا جتنا شکر ادا کروگے، اللہ تکبر سے اتنی ہی حفاظت رہے گی، کہنے کو تو یہ چھوٹا سا چٹکلہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑے کانٹے کی بات ہے، اور عمل کرنا بھی اس پر مشکل نہیں، صرف دھیان کرنے اور مشق کرنے کی بات ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

قوتِ ایمانی

# نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

محمد ارمغان بدایونی ندوی

تاریخ عالم میں قوموں کا عروج وزوال کوئی نئی بات نہیں ہے، تاریخ انسانی میں ایسی متعدد قومیں پیدا ہوتی رہی ہیں جن کی طاقت وقوت کا لوہا پوری دنیا نے تسلیم کیا اور ان میں سے بعض کا تذکرہ قرآن حکیم میں بھی موجود ہے۔ دنیا کے منظر نامہ میں عروج پانے والی قوموں کے اسباب پر اگر غور کیا جائے تو ان میں سے بعض کو سیاسی شعور حاصل تھا اور حکومت وانتظام چلانے کے طریقوں میں انہیں مہارت تھی، بعض کو تمدن و ثقافت کی دولت ملی ہوئی تھی اور بعض قومیں اپنی تلوار کے زور پر حاوی تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی بھی قوم کے پاس وہ سرمدی پیغام نہ تھا جو ہمیشہ کے لیے ان کی بقا کا ضامن ہو اور عالمگیر سطح پر ان کی قوت وسطوت منوانے کے لیے کافی ہو۔ اسی لیے یکے بعد دیگرے ہر تہذیب وتمدن اور ہر قوم کا ستارۂ اقبال غروب ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس کا نام ونشان تک نہ رہا، ارشاد ہے:

"وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُم مِّنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا" (اور ان سے پہلے ہم نے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا، کیا کسی کی آہٹ آپ محسوس کرتے ہیں یا ان میں کسی کی بھنک آپ سنتے ہیں)۔

بلاشبہ اقوام عالم کے درمیان امت مسلمہ بھی ایک قوم ہے جو اپنا خاص وزن اور مقام رکھتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی عروج کی انتہائی بلندیاں عطا کیں اور انہوں نے پوری دنیا کو علم وفضل سے مالا مال کیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جو بھی بہار اور ترقی ہے وہ سب مسلمانوں ہی کی مرہون منت ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہے کہ وہ دنیا کی دیگر قوموں کی طرح نہتے نہیں ہیں بلکہ وہ ایک خود کفیل قوم ہیں۔ ان کے پاس ایسے جاوداں اصول ہیں جو انہیں لازوال تہذیب عطا کرتے ہیں اور بے مثال تمدن سے ہم کنار کرتے ہیں، نہ وہ تعلیم میں دنیا کی کسی قوم کے محتاج ہیں اور نہ تہذیب وثقافت میں انہیں کسی کی حاشیہ برداری کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر ان کے پاس قرآن حکیم کی وہ دولت موجود ہے جو انہیں خلود ودوام بخشتی ہے اور اقوام عالم کے درمیان ہمیشہ ان کا قد بلند کرتی ہے۔ یہی وہ کتاب مقدس ہے جو مسلمانوں کو عروج کی منزلوں تک پہنچاتی ہے اور اسباب زوال سے باخبر کرتی ہے، یہی وہ خزینہ ہے جس سے دنیا کی دوسری قومیں تہی دامن ہیں، اسی لیے کسی نہ کسی موڑ پر آکر ان قوموں نے اپنا دم توڑ دیا اور وہ حوادثِ زمانہ کی تاب نہ لاسکیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے روز اول سے خطرات و مصائب کا مقابلہ کیا اور سخت سے سخت چیلنجز کو قبول کیا، مگر اسلام کا سدا بہار درخت ہمیشہ ہرا بھرا رہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دین کو ہمیشہ باقی رہنا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے، سچی بات یہ ہے کہ اس دین کی فطرت میں مٹنا نہیں بلکہ مٹانا ہے؛ شرک وکفر، ظلم وجبر اور تمام بدعنوانیوں کو، حتی کہ اگر اس کی راہ میں وہ لوگ بھی آڑے آجائیں جو ظاہر میں اسلام کے نام لیوا ہیں مگر حقیقت میں ان کی زندگی اس کی ترجمانی سے یکسر خالی ہوچکی ہے تو پھر یہ انہیں بھی لقمہ تر بنا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ" (اے ایمان والو! تم میں جو بھی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ آگے ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے)۔

ہر زمانہ میں مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ اپنے مقام ومنصب کو سمجھیں، اپنے فریضہ کو پہچانیں اور اقوام عالم کے درمیان اپنی اہمیت کو جانیں۔ انہیں یہ پتہ ہونا چاہیے کہ ان کے پاس دین متین اور قرآن حکیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بیش بہا دولت موجود ہے، وہ کسی خاص زمان ومکان اور کسی مخصوص قوم یا نسل تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر دور میں وہ تمام انسانیت کی ایک ضرورت ہے۔ اسی طرح انہیں یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ اگر کسی دور میں وہ زوال پذیر ہوتے ہیں اور اقوام عالم کے درمیان ان کا وزن گھٹتا ہے تو اس سے محض وہی متاثر نہیں ہوں گے بلکہ ان کی بے وزنی سے پورا عالم متاثر ہوگا اور دنیا کی تمام قومیں چیخ چیخ کر انہیں یہ صدا لگائیں گی کہ اے مسلمانو!

"أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ" (کچھ پانی میں سے یا جو رزق آپ کو ملا ہے اس میں سے کچھ ہمیں بھی عنایت کردو)۔

موجودہ دور میں اگر پوری دنیا کے مسلمانوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو بڑی حد تک مایوسی ہاتھ آتی ہے، ایک طرف وہ مسلمان طبقہ ہے جو تعیش پسندی کی تمام حدیں پار کر چکا ہے اور مادیت کی ریس میں دنیا کی دیگر قوموں کے شانہ بشانہ چل رہا ہے، نہ اسے اپنی ظاہری وضع قطع کا پاس ہے اور نہ ہی اسلامی شعائر کی جھجک۔ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو گرچہ تعیش پسند نہیں ہے مگر اسلام پر سو فیصد اس کا بھی یقین بحال نہیں ہے بلکہ وہ بھی دنیاوی عزت کمانے کی خاطر مغربی دنیا کے اصولوں کو اپنے لیے حرز جاں سمجھتا ہے۔ نہ وہ تعلیم میں اپنے آپ کو خود کفیل سمجھتا ہے، نہ طرز معاشرت میں، نہ وہ اسلام کے اقتصادی نظام سے عملاً اتفاق رکھتا ہے اور نہ ہی اسلام کے نظریہ سیاست سے، بلکہ اب تو حال یہ ہوگیا ہے کہ وہ یورپ کے ہر اُگلے ہوئے نوالے کو اپنے لیے کسی سوغات یا تریاق سے کم نہیں سمجھتا۔

ظاہر ہے ایسی صورت حال میں مسلمانوں سے یہ امید رکھنا فضول ہے کہ دنیا کی قومیں انھیں اپنے سروں پر بٹھائیں گی یا ان کو اپنے سر کا تاج سمجھیں گی بلکہ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ تو وہی ہونا ہے جو اس وقت عالم گیر سطح پر نظر آرہا ہے۔ آج ہر جگہ مسلمان ثانوی درجہ کے شہری کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں، میڈیا نے ان کے متعلق ذہنوں کو اتنا مسموم کردیا ہے کہ ہر جگہ اور ہر موقع پر لوگوں کی مشکوک نگاہیں انہی کی جانب اٹھتی ہیں، سیاست کی عالمی بساط پر آج وہی مہرے بنے ہوئے ہیں، سپر پاور طاقتیں انہی کی شبیہ کو ہر طرح سے داغ دار کرنے کے درپے ہیں اور ان کی نسلوں کو ختم کرنے کی اسکیمیں بنا رہی ہیں، کہیں انھیں ذہنی اذیتیں دی جارہی ہیں اور کہیں جسمانی اذیتوں سے بھی دوچار کیا جارہا ہے، دانش گاہوں میں انہیں اچھوت بنایا جارہا ہے، ملکی ایوانوں میں انہیں بے حیثیت کیا جارہا ہے، اقتصادی اعتبار سے انہیں کمزور کیا جارہا ہے اور سب سے بڑھ کر ان کے مذہبی مقدسات کو کھلم کھلا اپنا شکار بنایا جارہا ہے۔

مسلمانوں کی تصویر کے اس رخ کو دیکھ کر بظاہر یہ خطرہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اب اس منظر نامے پر زیادہ دنوں تک ان کی بقا مشکل ہے، لیکن یہ بات بالکل خلافِ واقعہ، خلافِ عقل اور مایوسی کی ہے۔ زندہ قوموں کی لغت میں ''مشکل'' اور ''ناممکن'' جیسے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ لوہے کو اپنی کلائی سے موڑنے کا ہنر انہیں اچھی طرح آتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ حالات اسی وقت تک خراب ہیں جب تک مسلمان خوابِ غفلت میں ہیں اور احتساب کے جذبہ سے عاری ہیں، جس دن انہوں نے زندگی کے میدان میں اُنہی سرمدی اصولوں کے ساتھ قدم رکھ لیا جو اصول قرآن حکیم اور نبی کریمؐ کے بیان کردہ ہیں، اسی دن دنیا ان کے قدموں میں ہوگی اور وہی اس کی قیادت کے اہل ہوں گے، مگر اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ مسلمان صحیح معنی میں ''ایمان'' اور ''عمل صالح'' کا مجسم پیکر بنیں۔ ارشاد ہے:

''وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ'' (تم میں جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضرور زمین میں حاکم بنائے گا جیسا اس نے ان کے پہلوں کو حاکم بنایا)۔

آج سب سے بڑھ کر ضرورت اسی ایمانی طاقت کی ہے جس کے سامنے ہر طاقت گرد ہے، یہی وہ طاقت ہے جس نے قیصر وکسریٰ کے تاج مسلمانوں کے قدموں میں لا کر رکھ دیے تھے۔ موجودہ مسائل ومشکلات کا واحد حل اور مایوسی کے بادلوں کو چھانٹنے کا نسخہ کیمیا یہی ''ایمانی طاقت'' ہے، ان شاء اللہ مستقبل مسلمانوں کا ہی ہوگا!

☆☆☆☆☆

## حیاتِ انسانی اور فرائض واعمال

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندویؒ

اسلام نے ایک خالص مسلمان کے لیے زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ معین کیا ہے وہ بیکاری و کاہلی کا ابتداء سے مخالف ہے، ایک مسلمان کی ہستی دنیا میں بے سود و بیکار رہنے کے لیے نہیں پیدا کی گئی، وہ ایک محاسب ہے جس کی نظر اشخاص کی مختلف حیثیات کے لحاظ سے ملک کے ہر ہر جزئی واقعہ پر پڑنی چاہیے، وہ اپنے گرد وپیش کا محافظ اعمال قرار دیا گیا ہے اور ان سب سے بھی قطع نظر کر لیا جائے تو صرف محاسبہ نفس اور اپنے اعمال کی نگرانی ایک ایسا اہم فرض ہے جو ایک سچے مسلمان کو کسی حالت میں بیکار نہیں رکھ سکتا۔ کاہلی و بیکاری کے جو عام معنی ہیں ان کے دفعیہ کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ ایک صادق العقیدہ اپنے ان تمام فرائض سے واقف ہوجائے جو شارع اسلام نے اس کے متعلق قرار دیے ہیں، حیاتِ انسانی کے اس نظام سے اسے خود بخود پتہ چل جائے گا کہ اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ فرائض واعمال سے وابستہ ہے، اور وہ فطرۃً اپنے کو باقاعدہ تنظیم کا رکن اور مفید ہستی بنانے کے لیے مجبور ہے۔

☆☆☆

پرانے چراغ

# حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ بحیثیتِ ادیب

محمد مکرم ندوی

ادب اور زندگی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ادب زندگی کا آئینہ دار ہے، وہ زندگی کے حقائق اور واقعات کی منظر کشی کرتا ہے، ادب ایک ایسا صاف وشفاف آئینہ ہے، جس کی مدد سے ہم عہدِ کہن کے حالات دیکھ سکتے ہیں۔

ادب کیا ہے؟ زندگی کے حالات وواقعات کو ایسے اسلوب میں پیش کرنا جو قاری کو دعوت فکر وعمل دے سکے، اس کے ذہن کو متاثر اور اس کے قلب کو مطمئن کر سکے ادب کہلاتا ہے، ادب ناتو وعظ وپند کا نام ہے، اور نا تاریخ نویسی کا، ادب نام ہے، زندگی کے حقائق سے بہرہ ور ہونے کا، ادب انسان میں گفتگو کا سلیقہ پیدا کرتا اور تحریر کا ہنر سکھاتا ہے۔

ادب تخلیق کرنے والوں کے اعتبار سے ان کا ادب بھی کئی خانوں میں تقسیم ہوسکتا ہے، چنانچہ جو ادب بچوں کی نفسیات اور ان کے مزاج کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا جائے وہ ''بچوں کا ادب'' کہلاتا ہے، اور جو ادب نوجوانوں کی ذہنی اور فکری ساخت کو مدنظر رکھتے ہوئے تخلیق کیا جائے وہ ''نوجوانوں کا ادب'' کہلائے گا۔ انسان کی زندگی میں بچپن یا لڑکپن کا مرحلہ بڑا ہی اہم سمجھا جاتا ہے، یہ ایسا مرحلہ ہے جہاں بچے چیزوں کو اخذ وقبول کرنے کے موڈ میں ہوتے ہیں (Receptive mode)، ایسے مرحلہ میں یہ ضروری ہے کہ ان کے مطالعہ کی میز پر کونسی کتابیں ہوں؛ کیوں کہ اس وقت جو باتیں ان کی نظروں سے گزرتی یا کانوں سے ٹکراتی ہیں، وہ بعد میں ان کی زندگیوں پر بڑے گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ایسا ادب ان کے لیے تخلیق کیا جائے جو تعمیری ہو، ایسا ادب جو ان کے ذہن کی تشکیل وتعمیر میں مثبت حصہ لے سکے، ان کا رشتہ اللہ اور اس کے رسول سے استوار کر سکے، ان کے دلوں میں خیر کی محبت اور شر کی قباحت اس طرح پیوست کر دی جائے کہ وہ زندگی کے اگلے اسٹیج پر ذہنی اور فکری الجھن کا شکار نا ہوں، صالح انسانی اقدار اور ثقافت کی بنیادی قدروں سے انہیں روشناس کیا جائے۔ اس طرح کا تعمیری ادب، اسلام کے علمی، تاریخی اور مذہبی ورثہ میں کثیر تعداد میں موجود ہے؛ لیکن اس کے مذہبی ہونے کی وجہ سے کسی کا ذہن اس طرف نہیں جاتا، یہ حقیقت ہے کہ یورپ اور اس کے زیر اثر جو ادب پروان چڑھا اس نے دین اور مذہب کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر رکھ دیا، ادب کا کام محض ذہنی سکون، لہو ولعب اور زبان کے چٹخارہ تک محدود ہوکر اور مذہب گرجا کی چہار دیواری میں محصور ہوکر رہ گیا۔

اسلامی ادب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت اور تاریخ وسیر سے عطر کشیدہ ہوتا ہے، جس میں الفاظ کی برجستگی وبے ساختگی کے ساتھ، سلامتی فکر اور اخلاقی قدریں بھی موجود ہوتی ہیں۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے زیر سایہ ادب اسلامی کا جو کارواں آگے بڑھا، اس کی اساس اس بات پر تھی کہ تعمیری ادب کے فروغ کے لیے کتاب وسنت اور اسلامی تاریخ کی عظیم الشان لائبریری میں خود اتنا صالح مواد موجود ہے، جس کے رہتے ہوئے ہمیں کہیں جانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، حضرت مولانا نے اپنی یہ فکر پہلے تو دمشق کے مؤقر علمی اکیڈمی میں مدلل طور پر پیش کیا، ''مختارات'' کے مقدمہ میں حضرت مولانا نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنا نظریہ پیش فرمایا ہے، اس مقصد کے لیے خود حضرت مولاناؒ نے عربی میں کافی لٹریچر تیار فرمایا، "القراءة الراشدة"، "مختارات من أدب العرب"، "قصص من التاريخ الاسلامی" اور "قصص النبيين" وغیرہ اسی سلسلہ کی نہایت اہم کڑیاں ہیں، اس کے علاوہ حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اپنے ارد گرد ادیبوں کی ایسی کھیپ تیار کردی تھی، جنہوں نے اسلامی ادب کی تشکیل وتعمیر میں نمایاں خدمات انجام دیں، اسلامی ذہن رکھنے والے عرب ادباء نے حضرت مولانا کے سامنے عملی طور پر رہنمائی کرنے اور کوشش کا اجتماعی نظام بنانے کی تجویز پیش کی، جس کے نتیجے میں موجودہ ادبی تنظیم رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل ہوئی؛ لیکن اس تشکیل سے پانچ سال قبل ۱۹۸۱ء میں ہی اس تحریک کی داغ بیل اس وقت پڑ چکی تھی، جب بین الاقوامی طور پر ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کا پہلا سہ روزہ سیمینار (۱۱-۱۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۷-۱۹/ اپریل ۱۹۸۱ء) منعقد ہوا تھا، جس کا موضوع ''عربی ادب اور دوسری زبانوں کے ادبیات میں اسلامی عناصر کی تلاش'' تھا، اس بین الاقوامی سیمینار میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ نے اپنا طاقت ور عربی مقالہ "الأدب الإسلامی وصلته بالحياة مع نماذج من صدر الإسلام" کے عنوان سے پیش کیا، جس میں حضرت مولاناؒ نے صدر اسلام کے

ادبی نمونوں کو سامنے رکھ کر یہ دکھایا کہ اسلام کے زیر سایہ ادب کس طرح پروان چڑھتا ہے، ادب اگر اسلام کے زیر سایہ پروان چڑھے اور نشو نما پائے تو یہ زندگی پر کس حد تک اثر ڈال سکتا ہے، اس کے بعد افصح العرب والعجم جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ اور حضرات صحابہ کرام کے ادبی نمونوں کو ''مشتے نمونے از خروارے'' کے طور پر پیش کیا گیا، صحابہ کرامؓ کے دونوں نمونے، نظم ونثر کے پیش کیے گئے ہیں، پھر عہد جاہلی اور عہد اسلامی کے شعری خصوصیات کا موازنہ کرکے یہ بتلایا گیا ہے کہ اسلام نے شعر میں کیا اصلاحات کیں۔

رابطہ ادب اسلامی کے قیام کے وقت سے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ مستقل اس کے جنرل سیکرٹری رہے، رابطہ ادب اسلامی اپنا سہ ماہی مجلّہ ''کاروان ادب'' بھی شائع کرتا ہے، اس پلیٹ فارم سے بھی حضرت مولانا نے بہ حیثیت مدیر اپنی خدمات پیش کیں، ''کاروان ادب'' کے اداریے اور شذرات کا مجموعہ ''غبارِ کاروان'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اسی طرح حضرت مولانا رحمہ اللہ کی کتاب "منثورات من أدب العرب" ادب اطفال کے موضوع پر بہت ہی شاندار کتاب سمجھی جاتی ہے، احادیث واخبار اور اسلامی تاریخ کے تقریباً تین سو کتابوں سے مستفاد ۱۸۷ر صفحات پر مشتمل یہ کتاب عربی زبان وادب کا ایک ایسا گنج گراں مایہ ہے، جس میں قوتِ احساس اور سلامتی فکر ہے، جو جمالیاتی اسلوب اور اسلامیانہ مزاج دونوں کا آمیختہ ہے، یہ کتاب "القراءة الراشدة" اور "مختارات من أدب العرب" کے درمیان خلا کو پر کرتی ہے، یہ کتاب نظم ونثر کا حسین انتخاب ہے، قدیم وجدید ادب کا حسین سنگم ہے، یہ انتخاب مرتب کی عربی زبان وادب پر دسترس اور فوقیت کی واضح دلیل ہے۔

ادب عربی میں حضرت مولاناؒ نے بیش بہا قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے، جو بہت بڑے خلا کر پر کرتی ہے، ادب عربی میں حضرت مولانا کی کتاب "الأدب العربی بین عرض ونقد" بھی کافی اہم ہے، یہ کتاب بنیادی طور پر تین بابوں میں منقسم ہے، پہلے باب میں حضرت مولانا نے ادب کی تعریف، حقیقت، اقسام، نیز ادب اور زبان کے مابین فرق کی نشان دہی کی ہے، دوسرا باب تحلیل وتنقید کے عنوان سے ہے، اور تیسرا باب عربی ادب کی تنقید اور اس کی تاریخ سے بحث کرتا ہے، اس کتاب پر مقدمہ لکھتے ہوئے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں:

''میں نے بہت سی کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں؛ لیکن اس کتاب پر مقدمہ لکھتے ہوئے غیر معمولی مسرت وسعادت کا احساس ہو رہا ہے؛ کیوں کہ اس کتاب سے برصغیر کے ادبی حلقہ میں ایک بڑا خلا پر ہو رہا ہے، یہ خلا ایک زمانہ سے باقی تھا، نثر اور شعر کے مجموعے تو کئی مرتب کیے گئے؛ لیکن ان نصوص کا تجزیہ، ان کی تنقیح اور خصوصیات کا تذکرہ اس کتاب کے ذریعہ سامنے آرہا ہے، اس کتاب سے ادب عربی کے ارتقاء کے مراحل پر گہری نظر پڑتی ہے، اور اس پر جو خارجی اثرات مرتب ہوئے اس کا بھی ذکر اس میں موجود ہے''۔ [مقدمۂ کتاب: ص۵]

مشہور ناقد اور ادیب شیخ احمد جندی نے "مجمع اللغة العربية" کے رسالہ میں کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ کتاب دار العلوم ندوۃ العلماء میں طلبہ کے سامنے پیش کیے گئے مصنف کے ادبی دروس کا مجموعہ ہے، اس میں تاریخ کے مختلف ادوار میں ادبی اسالیب کے ساتھ ادباء کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، نصوص اور متون کے تناظر میں تشریح اور تطبیق کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کتاب کی علمی حیثیت یہ ہے کہ یہ تنقید ادب کے اس طالب علم کے لیے پہلی کتاب ہے، جس نے صرف نثر ونظم کے مجموعے پڑھے ہیں، بلاشبہ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود عربی سے نا آشنا ملک اور عربی ادب کے طلبہ کی عظیم خدمت ہے، اور ہمارے ادب کا جامع خلاصہ ہے، وہ ہر لحاظ سے پسندیدگی اور پذیرائی کی مستحق ہے''۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس مختصر سے مضمون میں صرف اس کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

## حُبِ رسولؐ کا دعویٰ وعمل

مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ

اللہ تعالیٰ کا لحاظ، اس کا خوف، اس سے رحمت ومغفرت کی امید، اسی سے مدد مانگنا، اس کے ایک ایک حکم پر دل وجان سے عمل کرنا، اسی سے محبت کرنا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، بڑوں کی عزت اور خدمت کرنا، کمزوروں کی مدد کرنا، اپنی کمائی ان پر خرچ کرنا ہمارا شیوہ ہونا چاہیے، تبھی ہم محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کرنے میں سچے ہوں گے ورنہ زبان سے تو حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ اور عمل سے حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت دور ہو جائیں گے۔

☆☆☆

فقہ وفتاویٰ

# سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

**سوال**: معتکف اگر بیوی سے ضروری بات چیت کر لے مثلاً کھانے اور ضروری اشیاء کی خریداری کی بات کرے تو کیا اس کی اجازت ہے؟

**جواب**: حالت اعتکاف میں بیوی سے ضروری باتیں کرنے کی اجازت ہے؛ لیکن غیر ضروری اور پیار ومحبت کی باتیں کرنا مکروہ ہے۔

[ردالمحتار: ج۲/ص۱۸۵]

**سوال**: اگر معتکف کے کسی قریبی عزیز کا انتقال ہوجائے تو نماز جنازہ میں شرکت کے لیے جانے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟

**جواب**: معتکف کے لیے نماز جنازہ میں شرکت کے لیے مسجد سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی، اگر باہر چلا جائے تو اعتکاف فاسد ہوجائے گا اور قضا کرنی پڑے گی۔

[فتاویٰ تاتارخانیہ: ج۲/ص۴۱۲]

**سوال**: اگر رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فاسد ہوجائے تو اس کی قضا کس طرح کی جائے گی؟ کیا اس کے ساتھ روزہ رکھنا ضروری ہے؟

**جواب**: رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فاسد ہوجائے تو اس کی قضا روزے کے ساتھ ہوگی، ایک دن یا دو دن یا پورے دس دن کا اعتکاف فاسد ہوا ہو تو احوط یہ ہے کہ تمام صورتوں میں پورے دس دن کی قضاء روزوں کے ساتھ کرے لیکن یہ حکم وجوبی نہیں بلکہ جس دن اعتکاف مسنون توڑا ہے، اس کی قضا بھی کافی ہے۔

**سوال**: معتکف اگر بیمار ہوجائے اور دوا استعمال کرنے کے لیے روزہ توڑنا پڑے تو اس صورت میں بغیر روزہ کے اعتکاف ہوگا یا نہیں؟ یا اعتکاف توڑنا پڑے گا؟

**جواب**: کسی عذر شرعی کی وجہ سے روزہ افطار کرنا پڑے تو اس کی وجہ سے اعتکاف نہیں توڑا جائے گا، بلکہ اعتکاف پورا کیا جائے گا اور بعد میں روزہ کی قضا کی جائے گی۔

[فتاویٰ عالمگیری: ج۱/ص۲۱۲]

**سوال**: محلّہ کی مسجد میں اگر کوئی بھی اعتکاف کے لیے تیار نہ ہو، کسی نے تین دن کا اعتکاف کیا تو کیا اس سے سنت اعتکاف ادا ہوجائے گی؟

**جواب**: تین دن کے اعتکاف کا ثواب ملے گا؛ لیکن رمضان کے اخیر عشرہ کے اعتکاف کی سنت ادا نہیں ہوگی؛ کیونکہ دس دن کا اعتکاف ہونا چاہیے، محلّہ والے ترک سنت کے گنہگار ہوں گے۔

[فتاویٰ ہندیہ: ج۲/ص۲۱۱]

**سوال**: کیا شوال کے چھ روزے نہ رکھنے کی وجہ سے رمضان کے روزے ناقص رہ جاتے ہیں؟ اور درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتے ہیں بعض علماء کہتے ہیں کہ شوال کے یہ چھ روزے نہ رکھنے سے رمضان کے روزے کامل نہیں ہوتے؛ بلکہ لٹکے رہتے ہیں جب تک کہ یہ چھ روزے رکھ نہ لیے جائیں؟

**جواب**: شوال کے یہ چھ روزے مستحب ہیں اس کے نہ رکھنے کی وجہ سے رمضان کے روزے نہ ناقص ہوتے ہیں اور نہ ہی لٹکے رہتے ہیں، یہ محض غلط فہمی ہے جس کا دور کرنا ضروری ہے۔

**سوال**: صدقۃ الفطر کن لوگوں پر واجب ہے؟

**جواب**: عاقل بالغ مسلمان جو عید الفطر کے دن اپنی بنیادی ضروریات کے علاوہ ساڑھے باون تولہ (چھ سو بارہ گرام) چاندی یا اس کی قیمت کا مالک ہو، اس پر صدقہ فطر اپنی اور اپنے بچوں کی طرح سے ادا کرنا واجب ہے۔

[فتاویٰ ہندیہ: ج۱/ص۱۹۱]

**سوال**: صدقۂ فطر کی مقدار کیا ہے؟ اس کی مقدار کے بارے میں مختلف طرح کے اختلافات ہوتے رہتے ہیں، صحیح کیا ہے؟

**جواب**: احناف کے یہاں صدقۂ فطر کی مقدار نصف صاع گیہوں ہے، مولانا مفتی شفیع عثمانیؒ کی تحقیق کے مطابق ۱۳۶ تولہ، ۶ ماشہ ہے جو جدید اوزان میں ایک کیلو پانچ سو نوے گرام کے بقدر ہے، اتنی مقدار گیہوں یا اس کی قیمت نکالی جائے گی۔

[جواہر الفقہ: ج۱/ص۴۲۸]

**سوال**: صدقۂ فطر کب ادا کرنا چاہیے؟

**جواب**: صدقۂ فطر رمضان ہی میں ادا کردینا بہتر ہے؛ لیکن اگر کوئی رمضان میں ادا نہ کرسکے تو عید کے دن یا اس کے بعد ادا کردے۔

[بدائع الصنائع: ج۲/ص۱۹۹]

**سوال**: جو لوگ بیماری یا کسی مجبوری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ پاتے ہیں؛ لیکن صاحب نصاب ہیں، کیا ان پر بھی صدقۂ فطر واجب ہے؟

**جواب**: جو لوگ روزہ خواہ کسی وجہ سے بھی نہیں رکھ پاتے ہیں ان پر بھی صدقۂ فطر واجب ہے، شرط یہ ہے کہ وہ صاحب نصاب ہوں؛ کیونکہ صدقۂ فطر روزہ کے علاوہ الگ ایک مستقل فریضہ ہے جو صاحب نصاب پر واجب ہے۔

[ردالمحتار: ج۲/ص۷۴]

☆☆☆☆☆

**ندوۃ العلماء**
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

**NADWATUL-ULAMA**
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۱۰، ۲۵/اپریل ۲۰۲۴ء

Date 10, 25 April 2024

# اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

| (مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی | (ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی | (مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی | (مولانا) جعفر مسعود حسنی ندوی |
|---|---|---|---|
| معتمد تعلیم ندوۃ العلماء | معتمد مال ندوۃ العلماء | مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء | ناظر عام ندوۃ العلماء |

**NADWATUL ULAMA**

| | |
|---|---|
| عطیات | A/c No. 1086 3759 711 |
| تعمیرات | A/c No. 1086 3759 733 |
| زکوٰۃ | A/c No. 1086 3759 766 |

IFSC CODE : SBIN000125 - STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

**NADWATUL ULAMA**
اور اس پتہ پر ارسال کریں
**NIZAMAT NADWATUL ULAMA**
Nizamat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lukcnow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
**+91-8736833376**
پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا